① 86

استحکامِ پاکستان

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک نہایت اہم تحریر

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۹ / ۲۳۹۳۱

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد کرو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق لاہور

رسالہ

جلد ــــ ۳۵

شمارہ ــــ ۱

جنوری : ۱۹۸۶

بمطابق

ربیع الثانی : ۱۴۰۶ھ

زر سالانہ ۳۰ روپے

فی شمارہ ۳/- روپے

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

چودھری رشید احمد

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶ ـ کے ، ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ فون ۸۵۲۶۹۳

سب آفس : ۱۱ ـ داؤد منزل ، نزد آرام باغ ، شاہراہ لیاقت کراچی : فون ۲۱۶۵۸۲

مشمولات

عرضِ احوال ——— ۳

عاکف سعید

پاکستان کی عُمر کا چالیسواں سال اور اس کی دینی و تاریخی اہمیت ——— ۷

زیرِ تالیف کتاب 'استحکامِ پاکستان' کا مقدمہ

ڈاکٹر اسرار احمد

الھُدیٰ (۲۹ ویں نشست) ——— ۴۷

'حظِ عظیم' سورۃ حٰمٓ السجدہ کی آیات کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مسلح تصادم: غزوۂ بدر سے صُلح حدیبیہ تک ——— ۵۷

بسلسلۂ 'اسلامی انقلاب: مراحل، مدارج اور لوازم'

ڈاکٹر اسرار احمد

تاریخی گوشے ——— ۷۱

'انتخابِ امام الہند'

حکیم محمود احمد برکاتی

ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ ——— ۸۱

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کا خصوصی انٹرویو

شائع کردہ: یوپی ایکشن کمیٹی مسلم پرسنل لاء بورڈ لکھنؤ

رفتارِ کار ——— ۹۷

'ہندوستان میں پندرہ دن'

عاکف سعید

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ احوال

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

زیرِ نظر شمارہ شمسی تقویم کے اعتبار سے نئے سال کا پہلا شمارہ ہے اور اس سے 'میثاق' کی پینتیسویں (۳۵) جلد کا آغاز ہو رہا ہے۔ فللہ الحمد والمنۃ ——— اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ نئے سال کو ہم سب کے لیے خیر و برکت، امن و ایمان اور سلامتی و اسلام کا ذریعہ بنائے اور اس آنے والے سال میں ہمیں توفیق دے کہ ہم بیش از بیش دین کی خدمت کر سکیں ——— نئے سال کا آغاز جہاں ایک طرف ہمارے لیے مسرت و شادمانی کا موقع ہے وہیں ہمیں اس اہم حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہے کہ ہر گزرنے والا لمحہ دراصل ہماری مہلتِ عمر میں کمی کا باعث بنتا ہے ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

روزنامہ 'جنگ' میں 'استحکامِ پاکستان' کے عنوان سے والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی جو مفصل تحریر تسلسل کے ساتھ بالاقساط شائع ہو رہی ہے، اُس کے ابتدائی دو حصے اِس شمارے میں شاملِ اشاعت کیے گئے ہیں ——— پچھلے چند سالوں کے دوران والد محترم نے اِس مضمون کو بارہا اپنی تقاریر میں بیان فرمایا ہے، خصوصاً مختلف شہروں کی بار کونسلز میں جب بھی خطاب کا موقع ہوا، بالعموم استحکامِ پاکستان ہی کے موضوع پر گفتگو ہوئی ——— تاہم شدید خواہش کے باوجود اس موضوع پر قلم اٹھانے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اِس اہم مرحلے کا آغاز ہو چکا ہے اور اگرچہ سوا سو صفحات سے زائد مواد سپردِ قلم کیا جا چکا ہے لیکن غالباً ابھی تک اصل مضمون کا صرف نصف حصہ مکمل ہو پایا ہے۔ بلاشبہ یہ مضمون نہایت اہم ہے پاکستان کے عوام و خواص کی ایک عظیم اکثریت نظریۂ پاکستان اور اسلام کے حوالے سے جس بے یقینی اور الجھاؤ کی کیفیت سے دوچار ہے، جس کے باعث ہر چہار طرف بے مقصدیت کی فضا نظر آتی ہے، اِس فضا کو بہتر بنانے میں ہمیں قوی اُمید ہے کہ یہ مضمون بہت معاون ثابت ہوگا۔ جہاں یہ مضمون ذہنوں میں پھیلی ہوئی بہت سی غلط فہمیوں کے ازالے کا باعث بنے گا، وہیں ہمیں یہ بھی توقع ہے کہ اس کے ذریعے

آئندہ کے لیے ایک معین لائحہ عمل سامنے آئے گا۔ قارئین میثاق سے التماس ہے کہ وہ والدِ محترم کے لیے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ سے نوازے اور انہیں اس بات کی توفیق دے اور ان کے لیے حالات سازگار فرمادے کہ وہ اس مضمون کو مکمل شکل میں ضبطِ تحریر میں لاسکیں (آمین) ساتھ ہی قارئین سے یہ گزارش بھی ہے کہ خود اس مضمون کا بغور مطالعہ فرمائیں، اپنے حلقۂ احباب میں پھیلائیں بلکہ اسے اپنی گفتگو کا موضوع بنائیں تاکہ ایک اجتماعی سوچ پروان چڑھ سکے اور آئندہ کچھ کام کرنے کا عزم بیدار ہو۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بحیثیت قوم مزید مہلت عطا فرمادے اور ہماری ان مساعی کو شرفِ قبول عطا کرتے ہوئے پاکستان کو احیائے اسلام کے عمل کا ایک اہم ذریعہ بنادے۔ وما ذلك على الله بعزيز

قارئینِ میثاق کے علم میں ہے کہ گذشتہ لگ بھگ ۲ سالوں سے والدِ محترم کے بیرونِ ملک دوروں کا سلسلہ جاری ہے اور متواتر کئی سالوں سے یہ کیفیت تھی کہ سال میں کم از کم ایک یا پھر ایک سے زائد سفر بیرونی ممالک کے ہو جاتے تھے۔ لیکن اس بار ایسا ہوا کہ مسلسل ۱½ سال بیرونِ ملک کا کوئی سفر درپیش نہیں ہوا۔ پچھلے سال ماہ مئی میں عمرہ کے لیے جانا ہوا تھا اور پھر اکتوبر میں دوبارہ عمرے ہی کی ادائیگی کے لیے شدِّ رحال فرمایا۔ لیکن یہ ڈیڑھ سال کا فصل آئندہ پے درپے متعدد بیرونی دوروں کی تمہید بن گیا۔ اب پچھلے تین ماہ سے کیفیت یہ ہے کہ والدِ محترم ایک سفر سے واپس پاکستان تشریف لاتے ہیں تو دوسرے کے لیے پابہ رکاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ۲۱ اکتوبر کو والد صاحب عمرہ کی سعادت سے فیض یاب ہونے کے بعد واپس تشریف لائے تو ۲۰ نومبر کو عازمِ بھارت ہو گئے۔ وہاں سے ۴ دسمبر کو واپسی ہوئی تو ۱۱ دسمبر کو ابوظہبی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا ——— لیکن اب اللہ کا شکر ہے کہ ابوظہبی کے مختصر لیکن نہایت کامیاب اور بھرپور دورے کے بعد مستقبل قریب میں کوئی اور بیرونی سفر سرِدست درپیش نہیں ہے۔ تاہم اندرونِ ملک دوروں کا سلسلہ تا ہنوز جاری ہے چنانچہ ۲۰ دسمبر کو ابوظہبی سے مراجعت کے بعد ۲۳ تاریخ کو کراچی کے چار روزہ دورے کے لیے روانگی عمل میں آچکی ہے ——— پچھلے سال کے اوائل میں بھارت کا جو دورہ ہوا تھا۔ اس میں راقم کے برادرِ بزرگ ڈاکٹر عارف رشید صاحب محترم والد صاحب کے ہمراہ تھے اور اس بار قرعہ فال راقم کے نام نکلا (اس دورے کی مفصل رپورٹ کا ایک حصہ اسی شمارے میں شامل ہے) ابوظہبی کے دورے میں والدِ محترم کو ہمارے دو بزرگ ساتھیوں، شیخ جمیل الرحمٰن صاحب اور جناب قمر سعید قریشی صاحب کی معیت حاصل تھی۔ یہ دونوں حضرات وہیں سے عمرہ کی ادائیگی کے لیے حجازِ مقدس روانہ

ہو گئے ہیں اور واپسی ۲۰ ردسمبر تک متوقع ہے۔ اس دورے کی مفصل رپورٹ تو شیخ جمیل الرحمٰن واپسی پر سپردِ قلم فرمائیں گے جو ان شاء اللہ العزیز آئندہ شمارے میں شائع ہوگی تاہم ان کا ایک خط جو انہوں نے ابوظہبی سے ہمارے ایک معاونِ کار کو ارسال کیا ہے ہدیۂ ناظرین ہے۔

از ابوظہبی - ۱۸ دسمبر ۸۵ء

اخی المحترم شیخ رحیم الدین صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

الحمد للہ ثم الحمد للہ ابوظہبی کا پروگرام توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ کل شب تک آٹھ خطابات ہو چکے ہیں۔ ہر روز پہلے سے زیادہ حاضری ہوئی۔ جبکہ خیال یہ تھا کہ حاضری بتدریج کم ہو گی لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ ہر دن حاضری بڑھتی رہی۔ حال یہ تھا کہ ہال کے علاوہ جس میں سات سو FIXED نشستوں کا انتظام ہے مختلف گیلریاں اور ہال سے باہر شامیانہ میں پانچ ٹی وی سیٹوں کا انتظام تھا کہ جس سے شرکاء ڈاکٹر صاحب کا خطاب سن بھی سکتے تھے اور دیکھ بھی سکتے تھے۔ ہر پروگرام کی دوسرے دن وڈیو کیسٹ قریباً ایک سو اور آڈیو کیسٹ دو سو ڈھائی سو کے درمیان نکل جاتے ہیں۔ جتنی کتابیں یہاں لائی گئی تھیں، وہ دوسرے ہی دن ختم ہو گئیں۔

کل یہاں ۲۴ حضرات نے امیرِ محترم کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ ان شاء اللہ زبانی رپورٹ لاہور آکر پیش کروں گا اور میثاق کے لیے تحریری رپورٹ بھی لکھ کر لانے کی کوشش کروں گا۔ اللہ نے چاہا تو میں ۸ رجنوری ۸۶ء کو تیز گام پر لاہور پہنچوں گا۔ نوٹ فرمالیں۔

کل میں بھائی قمر سعید صاحب کے ہمراہ عمرہ کے لیے جا رہا ہوں، وہاں سے میں تو ۳۰ ردسمبر کو کراچی واپس پہنچ جاؤں گا۔ قمر صاحب ۲ رجنوری کو لاہور پہنچیں گے۔ خاکسار

جمیل الرحمٰن

آئندہ چار ماہ کے دوران تنظیم اسلامی کے متوقع اجتماعات کی تفصیلات اسی شمارے کے صفحہ ۱۲ پر درج ہیں جملہ رفقاء تنظیم سے گزارش ہے کہ وہ درج شدہ تاریخوں کے مطابق ابھی سے اپنا شیڈول مرتب کریں تاکہ ان اجتماعات میں شرکت ہو سکے ـــــ محترم مولانا سعید الرحمٰن علوی صاحب کے سلسلہ وار مضمون "دل افگندیم بسم اللہ مجریھا ومرسٰھا" کی قسط اس شمارے میں شامل نہیں کی جا سکی جس کے لیے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں، آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ وہ شامل اشاعت ہوگی ـــــ

عاکف سعید عفی عنہ

۲۵ ردسمبر ۸۵ء

حَتّٰٓی

یہاں تک کہ

اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ

جب وہ اپنی پوری پختگی کو پہنچتا ہے

وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً

اور چالیس برس کا ہو جاتا ہے

قَالَ

تو کہتا ہے کہ

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ

اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں ان انعامات کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیے

وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ

اور ایسے نیک اعمال کروں جو تجھے پسند ہوں

وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ

اور میری اولاد کو میرے لیے بھلائی کا ذریعہ بنا

اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں — اور — میں فرمانبرداروں میں سے ہوں!

(سورۃ احقاف - آیت - ۱۵)

بڑے بھائی کی خدمت میں — چالیسویں سالگرہ کے موقع پر

منجانب ——— خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

زیرِ تالیف کتاب 'استحکامِ پاکستان' کا مقدمہ

پاکستان کی عمر کا چالیسواں (؟) سال

اور اُس کی دینی و تاریخی اہمیّت

ڈاکٹر اسرار احمد

چونکہ ہم بالعموم شمسی تقویم کے عادی ہیں لہٰذا عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۸۵ء کو پاکستان نے اپنا اُنتالیسواں یومِ استقلال منایا ہے۔ گویا اُس روز اُس نے اپنی عمر کے اڑتیس سال پورے کر کے انتالیسویں سال میں قدم رکھ دیا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ ہماری دینی تقویم قمری ہے۔ اُس کے حساب سے دیکھا جائے تو کسی قدر مختلف معاملہ سامنے آتا ہے۔ اِس لیے کہ پاکستان کا قیام ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کو عمل میں آیا تھا۔ اس طرح ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ کو اُس کی عمر کے انتالیس سال پورے ہو گئے ہیں اور اُس نے چالیسویں سال میں قدم رکھ دیا ہے۔ (اور اِن سطور کی تحریر کے وقت اُس چالیسویں سال کے بھی چار ماہ سے زائد گذر چکے ہیں!)

انسان کی پختگی کی عمر: چالیس سال

یہ بات تو قرآنِ حکیم کا ہر طالب علم اور دینی مزاج کا حامل ہر شخص جانتا ہے، کہ انسانی زندگی میں چالیس سال کی عمر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور انسان کی پختگی کی عمر

چالیس برس ہے۔ چنانچہ سورۂ اَحقاف کی آیت نمبر ۱۵ میں یہ الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے ہیں:

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ . . . (الآیہ)	(ترجمہ) "یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری پختگی کو پہنچا اور چالیس برس (کی عمر) کو پہنچ گیا تو اس نے کہا. . . ."

ظاہر ہے کہ اس سے مُراد جسمانی بلوغت نہیں ہے بلکہ شعوری اور نفسیاتی پختگی[1] ہے۔ چنانچہ اُس کے ضمن میں یہ آیۂ مبارکہ نص کا درجہ رکھتی ہے۔

آغازِ وحی کی عمر: چالیس سال

اِسی طرح اگر اس اصول کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ "استثنآت کُلیّہ کو ثابت کرتے ہیں"[2] تو سب جانتے ہیں کہ قانونِ قدرت یا سنّت اللہ یہی رہی ہے کہ نبوّت کا ظہور[3] یعنی وحی کا آغاز چالیس برس کی عمر میں ہوتا رہا ہے۔ (اس قاعدہ کُلیّہ سے مستثنیٰ غالباً صرف حضرت مسیح علیہ السلام ہیں، اور ہر شخص جانتا ہے کہ اُن کی تو پوری شخصیت ہی 'خرقِ عادت'[4] کی حیثیت رکھتی ہے۔) چنانچہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں تو صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ:

عن ابنِ عباسؓ قال بُعِثَ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم لِاَرْبَعِيْنَ سَنَةً فَمَكَثَ بِمَكَّةَ ثَلٰثَ عَشَرَةَ سَنَةً يُوحٰى اليهِ ثُمَّ اُمِرَ بِالْهِجْرَةِ	(ترجمہ) "حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم چالیس برس کی عمر میں مبعوث ہوئے۔ اس کے بعد تیرہ برس مکّہ میں مقیم رہے۔

---

[1] 'Intelloctual and Psychological Maturity'

[2] "EXCEPTIONS PROVE THE RULE"

[3] نہ کہ آغاز !!

[4] یعنی عام قوانینِ طبعیہ کے خلاف !

فهاجرَ عشرَ سنینَ وماتَ وھُوَ ابنُ ثلٰثٍ وستّینَ سنَتَہً ۔
(بخاریؒ و مسلمؒ)

اور آپؐ پر وحی نازل ہوتی رہی۔ پھر آپؐ کو ہجرت کا حکم ہُوا تو آپؐ نے ہجرت فرمائی اور دس برس (مدینہ میں مقیم) رہے اور تریسٹھ برس کی عمر میں آپؐ نے وفات پائی ۔
(اس کو روایت کیا امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں نے)

پس ثابت ہُوا کہ از روئے قرآن وحدیث انسان کی عقلی وشعوری بلوغت اور جذباتی ونفسیاتی پختگی کی عمر چالیس سال ہے۔

بنی اسرائیل کی چالیس سالہ صحرانوردی

اور چالیس سال کے بعد انقلابِ حال

اب چونکہ افراد ہی سے اجتماعیت وجود میں آتی ہے اور بقول علامہ اقبال : ؎

" افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر   ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا ! "

لہٰذا قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ اجتماعیتِ انسانیہ میں بھی چالیس برس کی مدت کو اہمیت حاصل ہونی چاہیئے۔ اور قرآن حکیم میں بھی اس کی کم از کم ایک مثال تو نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ سورۃ مائدہ کے چوتھے رکوع میں تفصیلاً مذکور ہے کہ مصر سے خروج (EXODUS) کے کچھ عرصے کے بعد جب بنی اسرائیل کو 'قتال فی سبیل اللہ' کا حکم ہُوا اور انہوں نے اس سے پہلوتہی اختیار کی اور اللہ کے دو جلیل القدر پیغمبروں یعنی حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون علیہما السّلام اور اُن کے دو وفادار اور تقویٰ شعار ساتھیوں یعنی یوشع بن نُون اور کالب بن یفنّا رحمہما اللہ کی کُل تشویق وترغیب اور فرمائش وفہمائش کے جواب میں بالکل دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ :

"قَالُوا یٰمُوسٰی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَھَا   (ترجمہ) " انہوں نے کہا : " اے موسیٰ !

اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا	ہرگز اس (سرزمین مقدس) میں داخل
فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ	نہ ہوں گے جب تک وہ (یعنی عمالقہ) وہاں
فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ۝	موجود ہیں۔ پس جاؤ تم اور تمہارا رب اور
(المائدہ : ۲۴)	تم دونوں جنگ کرو، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں
	گے!"

تو اس پر ایک جانب تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اس درجہ بیزاری کی کیفیت طاری ہوئی کہ انہوں نے بارگاہِ خداوندی میں اپنی بے بسی کے ذکر کے ساتھ اپنی اُمّت سے قطع تعلق کی اجازت طلب کی:

"قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا	(ترجمہ) "موسےٰ نے عرض کیا: "اے رب
نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا	میرے! مجھے تو سوائے اپنی جان اور اپنے
وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝"	بھائی کے (اور کسی پر) کوئی اختیار حاصل
(المائدہ : ۲۵)	نہیں ہے۔ پس علیحدگی فرما دے ہمارے اور
	ان نافرمان لوگوں کے مابین!"

اور دوسری جانب اللہ تعالیٰ نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ اگر یہ لوگ بزدلی نہ دکھاتے تو ہم ارضِ مقدس ابھی ان کو عطا فرما دیتے لیکن اُن کے قتال فی سبیل اللہ سے جان چُرانے کی بنا پر یہ ارضِ مقدس اُن پر چالیس برس تک حرام رہے گی اور اس عرصے کے دوران یہ اسی صحرائے سینا میں بھٹکتے پھریں گے ــــ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

"قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ	(ترجمہ) "اللہ نے فرمایا: اب یہ
عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً	(ارضِ مقدس) ان پر چالیس برس تک
يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ط"	حرام رہے گی (اور) یہ زمین میں بھٹکتے
(المائدہ : ۲۶)	(ہی) رہیں گے!

تاریخ بتاتی ہے کہ اسی چالیس سال کے عرصے کے دوران حضرتِ موسیٰؑ کا بھی انتقال ہوگیا اور حضرتِ ہارونؑ کا بھی، اور یہ دونوں جلیل القدر پیغمبر اللہ کے دین اور اپنی اُمّت کے ارضِ مقدس پر غلبہ و تمکّن کو اپنے جسدِ عنصری کی آنکھوں سے دیکھے بغیر دنیا سے رخصت

ہو گئے! لیکن چالیس برس کی مدت کی تکمیل کے بعد بنی اسرائیل کی اُس نئی نسل نے جو صحرا ہی میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی تھی حضرتِ یوشع بن نُون کی قیادت میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے مراحل طے کیے اور اس طرح بنی اسرائیل کی تاریخ کے عہدِ زرّیں کے آغاز کی تمہید ہوئی۔

بنی اسرائیل اور اُمّتِ مُسلمہ کے حالات میں عمومی مُشابہت

واضح رہے کہ اگرچہ نظری طور پر تو یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ جتنے رسول دنیا میں مبعوث ہوئے اُتنی ہی مسلمان اُمّتیں بھی لازماً وجود میں آئی ہوں گی، خواہ بڑی خواہ چھوٹی، لیکن قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اہم ترین اور قابلِ لحاظ اور قابلِ ذکر اُمّتیں دو ہی ہیں: پہلی اُمّتِ موسیٰؑ یعنی بنی اسرائیل اور دوسری اُمّتِ محمدؐ یا موجودہ اُمّتِ مُسلمہ!

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں بڑی گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک جانب خارج سے وارد و واقع ہونے والے حالات و واقعات کے ضمن میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے یہ الفاظِ مبارکہ منقول ہیں،

"لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِيْ كَمَا أَتٰى عَلٰى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ" (ترمذیؒ عن عبد اللہ بن عمرو رض)	(ترجمہ) "میری اُمّت پر بھی مصائب و حوادث اسی طرح واقع ہوں گے جیسے بنی اسرائیل پر ہوئے، بالکل ایسے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے!"[1]

اور دوسری جانب اُمّت کے داخلی احوال و کوائف اور اعمال و اشغال کے ضمن میں آپؐ نے یہ فرمایا ہے کہ:

[1] ان سطور کے راقم نے جب اِس حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کی روشنی میں اُمّتِ مُسلمہ کی تاریخ کا بنظرِ غائر جائزہ لیا تو اسے اُمّت کی گذشتہ چودہ سو سالہ تاریخ کے دوران دو بار

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

" لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ تَبِعْتُمُوْهُمْ " — قِيْلَ : " يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! اَلْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى ؟ قَالَ : فَمَنْ ؟ "

(ترجمہ) "حضورؐ نے فرمایا : " تم لازماً ان لوگوں (کے طور طریقوں) کی پیروی کرو گے جو تم سے پہلے گذرے ہیں، بالشت کے ساتھ بالشت اور ہاتھ کے ساتھ ہاتھ (کے انداز میں) یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بل میں گھسے تھے تو تم بھی ان کی پیروی کرو گے!" پوچھا گیا: " حضور! کیا یہود اور نصاریٰ (مراد ہیں)؟" فرمایا : " تو اور کون ؟ "

(بخاریؒ و مسلمؒ عن ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ)

(اس حدیث کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت کیا)

واقعہ یہ ہے کہ اِس حدیثِ مبارک کی عظمت اور صدفی صد حقانیت کا کسی قدر اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب انسان بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد شدہ اُس مفصّل فردِ جُرم کی روشنی میں اُمّتِ مسلمہ کی موجودہ دینی و اخلاقی اور ایمانی و عملی حالت کا جائزہ لیتا ہے جو سورۂ بقرہ کے چھٹے رکوع سے شروع ہو کر پندرھویں رکوع کے آغاز تک پھیلی ہوئی ہے۔ اِس لیے کہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ کوئی نظری و فکری، اعتقادی و ایمانی اور اخلاقی و عملی گمراہی ایسی نہیں ہے جو سابقہ اُمّت میں پیدا ہوئی ہو اور موجودہ اُمّتِ مسلمہ اس سے بچی رہ گئی ہو۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی تو بالکل ایسے لگتا ہے جیسے کہ یہ سارا خطاب " در حدیثِ دیگراں " کے انداز میں اصلاً اُمّتِ محمّد علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام ہی سے ہو رہا ہے!

(حاشیہ گذشتہ صفحہ سے پیوستہ)

عروج اور دوسری بار زوال کا بعینہٖ وہی نقشہ نظر آیا جو بنی اسرائیل کی تاریخ کے خلاصے کے ضمن میں سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اب سے ٹھیک گیارہ سال قبل راقم نے اپنے اسی مشاہدے، اور غور و فکر کے، نتیجے کو میثاق بابت اکتوبر تا نومبر ۱۹۷۴ء میں شائع کر دیا تھا اور اب وہ تحریر راقم کی تالیف 'سرافگندیم' میں بطور مقدّمہ شامل ہے اور برادرم ڈاکٹر ابصار احمد کے قلم سے اُس کا انگریزی ترجمہ بھی "RISE AND DECLINE OF THE MUSLIM UMMAH" کے نام سے مطبوعہ موجود ہے۔

برِصغیر کے مُسلمانوں کی تاریخ اور تاریخ بنی اسرائیل
کے ابتدائی دَور کے مابین حیرت انگیز مماثلت

متذکرہ بالا کُلّی مشابہت اور مماثلت کے ساتھ ساتھ بعض جزوی مشابہتوں کا معاملہ مزید حیران کُن ہے۔ بالخصوص برِصغیر پاک و ہند کی مسلمان قوم کی ماضی قریب کی تاریخ اور ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے موجودہ احوال و کوائف اور تاریخ بنی اسرائیل کے اوّلین دَور کے حالات و واقعات کے مابین جو مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے اُس کی تو غالباً کوئی دوسری نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہ مل سکے!

بنی اسرائیل کی معجزانہ نجات

سب جانتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السّلام کے زمانے میں مصر میں آباد ہونے کے بعد کئی صدیوں تک بنی اسرائیل مصر میں نہایت عیش اور آرام کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد تدریجاً حالات میں انقلاب آیا اور اُن پر شدائد و مصائب کے اُس دَور کا آغاز ہو گیا جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی بعثت سے متصلاً قبل اپنے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچ گیا۔ بنی اسرائیل اُس زمانے میں جن حالات سے دوچار تھے اُن کی تعبیر قرآن مجید کے متعدد مقامات پر قلیل فرق و تفاوت کے ساتھ ان الفاظ میں ہوئی ہے:

"يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (ترجمہ) "وہ چکھاتے تھے تمہیں بدترین عذاب
يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ کا مزہ (یہاں تک کہ) ذبح کر ڈالتے تھے
وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تھے
وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ تمہاری عورتوں کو اور اس میں یقیناً
رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝" تمہارے لیے تمہارے ربّ کی جانب سے
(البقرہ : ۴۹) بڑی آزمائش تھی۔"

—— (واضح رہے کہ سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۴۱ میں بھی یہ الفاظ مبارکہ جُوں کے تُوں وارد

ہوتے ہیں، صرف اس ایک فرق کے ساتھ کہ "یُذَبِّحُوْنَ" کی بجائے "یُقَتِّلُوْنَ" کا لفظ استعمال ہُوا ہے) چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی بعثت ہی اللہ تعالیٰ کے اِس ارادے اور مشیّت کے ساتھ ہوئی تھی کہ اُن کے ذریعے بنی اسرائیل کو اِس عذاب سے نجات دلائی جائے، چنانچہ سورۂ قصص میں ارشاد ہوتا ہے :

"وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى	(ترجمہ) "اور ہم چاہتے تھے کہ احسان
الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي	فرمائیں ان لوگوں پر جنہیں زمین میں دبا
الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ	لیا گیا تھا اور بنا دیں ان ہی کو سربراہ
اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ	اور بنا دیں ان ہی کو (زمین کا) وارث!"
الْوٰرِثِيْنَ ۝" (القصص : ۵)	

اور اگرچہ آنجنابؑ کی بعثت کے مقاصد میں وہ جملہ اُمور بھی لازماً شامل تھے جن کے لیے تمام انبیاء و رسل مبعوث کیے گئے۔ یعنی دعوت الی اللہ اور شہادت علی الناس، تاہم آپؑ کی بعثت کا ایک خصوصی مقصد بنی اسرائیل کی نجات تھا۔ یہی وجہ ہے کہ منصبِ رسالت پر فائز ہونے کے بعد فرعون سے اپنی پہلی ہی ملاقات میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے یہ مطالبہ پیش فرمادیا کہ :

"اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ	(ترجمہ) "ہم دونوں تمہاری جانب
مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا	تمہارے رب کے پیغامبر ہیں۔ پس
تُعَذِّبْهُمْ"	بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو
(طٰہٰ : ۴۷)	اور اُن کو مت ستاؤ۔"

اِس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی دعوت و تبلیغ، انذار و تبشیر اور فرمائش و فہمائش پر فرعون اور آلِ فرعون کی جانب سے کیا ردِّ عمل ظاہر ہُوا — اور کس طرح "تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ" (بنی اسرائیل : ۱۰۱) یعنی نو عظیم معجزات دیکھنے کے باوجود "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!" کے مصداق نہ صرف یہ کہ اُن کے کفر و اعراض اور تعلّی و استکبار میں اضافہ ہوتا چلا گیا بلکہ خود بنی اسرائیل پر اُن کے تشدّد کی شدّت

بڑھتی چلی گئی ـــــ بہرحال یہ طویل داستان جس نتیجے پر منتج ہوئی وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے پے بہ پے معجزات کے ذریعے نجات عطا فرمائی۔ چنانچہ ان کی نگاہوں کے سامنے حضرت موسیٰؑ کے عصا کی ایک ہی ضرب سے سمندر پھٹا جس سے اُن کے بچ نکلنے کی سبیل پیدا ہوئی۔ پھر عین اُن کی نگاہوں کے سامنے اُن کا دشمن پورے لاؤ لشکر سمیت غرق ہُوا، پھر عصا کی ایک ہی ضرب سے ایک چٹان سے اُن کے لیے پانی کے بارہ چشمے پھُوٹ نکلے، بے آب وگیاہ بیابان میں اُن کے لیے من وسلویٰ کی صورت میں غذا نازل فرمائی گئی، انہیں دھُوپ کی شدت وتمازت سے بچانے کے لیے غمام کا اہتمام کیا گیا۔ بعدازاں الواح کی صورت میں تورات عطا فرمائی گئی اور اُس کی پیروی اور شریعت کی پابندی کا عہد ومیثاق لیتے ہوئے کوہِ طُور کو ان کے سروں پر معلق کر دیا گیا۔

ابتدائی کم ہمتی اور بعد کی عزیمت کا سبب

موضوع زیرِ بحث کے اعتبار سے اصل غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ ہجرت سے قبل مصر میں آلِ فرعون کے ساتھ خود بھی "تِسْعَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ" کا مشاہدہ بچشم سر کر چکنے اور پھر سفرِ ہجرت کے دوران متذکرہ بالا جملہ آیات ومعجزات کا مشاہدہ ہی نہیں تجربہ کر چکنے کے باوجود بنی اسرائیل نے اللہ کے جلیل القدر پیغمبرؑ اور اپنے عظیم نجات دہندہ کے ساتھ مسلسل نافرمانی اور اذیت رسانی کا وہ طرزِ عمل کیوں اختیار کیا جس پر رسولؑ کو یہ فریاد کرنی پڑی کہ:

" یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ	(ترجمہ) " اے میری قوم کے لوگو! مجھے
وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ	کیوں اذیت پہنچا رہے ہو درآں حالیکہ
رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ ۔"	تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری جانب
(الصّف : ۵)	اللہ کا رسول ہوں! "

اِس لیے کہ اُن کے اسی طرزِ عمل کا نقطۂ عروج ہے وہ واقعہ جس کا آغاز میں ذکر ہو چکا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰؑ کی تمام تر ترغیب وتحریض اور فرمائش وفہمائش کے باوجود "قتال فی سبیل اللہ" سے اعراض وانکار! ـــــ جس کی پاداش میں اُن پر چالیس سالہ صحرانوردی مسلط کر دی گئی

چنانچہ وہ چالیس برس بیابان سینا ہی میں (IN THE WILDERNESS OF SINAI)
بھٹکتے رہے اور "یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ" کی مناسبت سے اُس کا نام ہی "صحرائے تیہہ" پڑ گیا ـــــ پھر اسی مسئلے کا تتمہ یا تکملہ ہے یہ سوال کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اُسی قوم کی اگلی نسل میں اتنی ہمت و عزیمت پیدا کر دی اور اُس کی اِس درجہ کایا پلٹ کر رکھ دی کہ اس کے باوجود کہ وہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السّلام ایسے جلیل القدر پیغمبروں کی صحبتِ معیّت سے محروم ہو چکے تھے اور ان کی سربراہی و رہنمائی کے فرائض وہ شخص ادا کر رہا تھا، جس کی نبوّت اور رسالت کا کوئی صریح ثبوت کم از کم قرآنِ حکیم میں موجود نہیں ہے ـــ (یعنی حضرت یوشع بن نون) تاہم انہوں نے اس کی سرکردگی میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے جملہ مراحل بحسن و خوبی طے کیے۔ چنانچہ وہ ارضِ مقدّس جو چالیس برس تک کے لیے ان پر حرام کر دی گئی تھی، اُن کے ہاتھوں فتح ہوئی اور اُن کے دورِ غربت کا خاتمہ اور دورِ عروج کا آغاز ہو گیا؟ ـــ ؟؟

ظاہر ہے کہ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ممکن ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ حضرت موسیٰؑ کی معیّت میں مصر سے نکلے تھے، وہ نسلاً بعد نسلٍ غلامی کی چکّی میں پستے رہنے کے باعث بزدل اور بودے ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک جانب اُن میں سے اکثر کی غیرت و حمیّت کچلی جا چکی تھی اور دوسری جانب وہ عزیمت و مقاومت سے عاری اور تہی دست ہو چکے تھے۔ اور ماضیٔ قریب کی شدید ترین تعذیب (PERSECUTION) نے تو گویا اُن کے حوصلے اور قوّتِ ارادی کا جنازہ نکال دیا تھا، چنانچہ وہ مصر میں شدید ترین محنت و مشقّت تو کرتے تھے لیکن خود اپنے عزم و ارادے کی اساس پر نہیں بلکہ آلِ فرعون کے کوڑوں اور ڈنڈوں کے خوف سے ـــــ اِس کے برعکس بنی اسرائیل کی جس نسل نے جہاد و قتال کی پُرعزیمت راہ اختیار کی وہ وہ تھی جو آزادی کی فضا میں پیدا ہوئی اور اسی فضا میں پلی بڑھی اور پروان چڑھی چنانچہ اُن میں غیرت و حمیّت کے اوصاف بھی پیدا ہوئے اور عزّتِ نفس اور خودداری کے احساسات بھی! ـــــ اور اس سونے پر سہاگے کا کام کیا صحرا کی پُرصعوبت زندگی نے جس سے اُن میں سخت کوشی اور جفاکشی کی عادت پیدا ہوئی اور بقول

علامہ اقبال مرحوم سے

"فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی"

مسلمانانِ ہند پر انگریز کی دو صد سالہ غلامی کے اثرات

ان حقائق کی روشنی میں

اب ذرا غور کیجئے مسلمانانِ ہند کی ماضیٔ قریب کی تاریخ اور ملتِ اسلامیہ پاکستان کی موجودہ صورتِ حال پر!

صنم خانۂ ہند میں اسلام کا وُرودِ اوّل ۷۱۲ء میں ہُوا اور اس وقت سے لے کر ۱۷۵۷ء تک یعنی ایک ہزار سال سے زائد عرصہ برِصغیر پر مسلمانوں نے جزوی یا کلّی طور پر حکومت کی! اس کے بعد لگ بھگ دو سو برس انگریز کی غلامی میں گذرے اور اس دو صد سالہ غلامی کے دوران برِصغیر کے بعض علاقوں میں مسلمانوں کی کم و بیش آٹھ اور بعض علاقوں میں لگ بھگ چھ نسلیں بیت گئیں اور کیسے ممکن تھا کہ اس کے اثرات و نتائج کا ظہور نہ ہوتا!

یہ درست ہے کہ ان دو سو سالوں کے دوران انگریز کی جانب سے بڑے پیمانے پر ظلم و تشدّد، قتل و غارت اور لُوٹ مار کا معاملہ تو ایک ہی بار ہُوا یعنی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد۔ اس سے قبل کے سو سالہ دَور میں یا میدانِ جنگ میں کھلے مقابلے کا معاملہ رہا یا میدانِ سیاست کے دجل و فریب، بدعہدی و بے وفائی اور مکّاری و دسیسہ کاری کا ــــ اور بعد کے نوّے سالوں کے دوران بھی اگرچہ دینی حمیّت اور جذبۂ حُرّیت سے سرشار بے شمار مسلمان، بالخصوص علماءِ کرام، قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے، جیل خانوں میں تعذیب و تشدّد کا نشانہ بنتے، پھانسی کے پھندوں میں جھُولتے یا حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور کی سزائیں پاتے نظر آتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اُن کی کُل تعداد ہندوستان کے مسلمانوں کی مجموعی تعداد کے اعتبار سے آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں بنتی! ــــ تاہم عہدِ حاضر کے اِس بدترین استعمار نے ایک جانب مسلمانانِ برِصغیر کی بحیثیتِ مجموعی غیرت و حمیّت اور خودداری و عزّتِ نفس کو کچلنے کے لیے وہ تمام حربے استعمال کیے جو ہمیشہ سے استعماری

قوتوں کا معمول رہے ہیں ــــ یعنی :

"اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً" (النمل : ۳۴)

(ترجمہ) "یقیناً بادشاہ جب کسی بستی (یا ملک) میں (فاتحانہ) داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد برپا کر دیتے ہیں اور اُس کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر ڈالتے ہیں!"

جس کی بہترین تعبیر کی ہے علامہ اقبال مرحوم نے اپنے اِن اشعار میں : ؎

"آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ 'اِنَّ الْمُلُوْكَ' سلطنتِ اقوامِ غالب کی ہے اِک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری!
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری"

نتیجتہً ان دو سو سالوں کے دوران ؎ "کہ غیرت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے!" کے مصداق اسلامیانِ ہند کا جو فرد یا گروہ غیرت و حمیّت اور عزّتِ نفس کے اعتبار سے جتنا 'ہلکا' ہوتا چلا گیا اُتنا ہی اُوپر اُٹھتا اور سرکار دربار میں 'باعزّت' بنتا چلا گیا اور جن کے قدموں میں غیرت و حمیّت کی بیڑیاں پڑی رہ گئیں، وہ معاشی و معاشرتی اعتبار سے پست سے پست تر ہوتے چلے گئے ــــ اور دوسری جانب عہدِ حاضر کے اِس 'فرعونِ جدید' نے "يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَكُمْ" کی ایک نئی اور بظاہر بڑی معصوم اور بے ضرر لیکن حقیقتاً حد درجہ مؤثر اور تیر بہدف صورت اختیار کی ــــ یعنی ایک نئے نظامِ تعلیم کے ذریعے انگریزی زبان اور مغربی تہذیب و تمدّن کی ترویج اور اس 'ثقافتی انقلاب' کے ذریعے نئی نسلوں کا اپنے ماضی سے کامل انقطاع جو قومی و ملّی سطح پر قتلِ عام سے ہرگز کم نہیں اور گویا "يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ" کی جدید اور مہذّب صورت ہے ــــ بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم ؎

"یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!"

قومی و اجتماعی سطح پر اِس 'کردار کشی' کا جو نتیجہ نکلا اُسے کسی صاحبِ درد نے یوں بیان کیا ہے کہ -

"میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں اُلجھ کر اکثر   تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیئے!
نئی تہذیب کی بے رُوح بہاروں کے عوض   اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے!"

اور اس جلتی آگ پر تیل کا کام کیا "آزادیٔ نسواں" کی اُس تحریک نے جس نے ہمارے عائلی سماجی نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا، خاندان کے مقدس ادارے کی چُولیں ہلا دیں، شرم وحیا کا دیوالہ نکال دیا اور عصمت وعفت کے معیارات ختم کر دیئے ـــــ اور اس طرح گویا "وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَاءَکُمْ" کی ایک جدید تفسیر عملاً پیش کر دی۔

پنجاب اور سرحد کا اضافی المیہ

اس اعتبار سے بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ وسطی پنجاب اور اس سے ملحقہ صوبۂ سرحد کے علاقے کے مسلمان ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہی بدقسمت اور مظلوم ثابت ہوئے اس لیے کہ اُن پر انگریزوں کی غلامی سے متصلاً قبل، اوّلاً سکھوں کی دہشت گردی، لُوٹ مار اور قتل وغارت گری اور بعد ازاں باضابطہ "سکھا شاہی" مسلط رہی جو یقیناً "یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ" کی بدترین صورت تھی۔ نتیجتہً ایک طرف تو اُن کی خودی اور عزتِ نفس زیادہ ہی پامال ہوئی، اور اُن کی غیرت وحمیت کچھ زیادہ ہی مجروح ہوئی اور دوسری طرف انہوں نے انگریز کی آمد کو غنیمت جانا اور اپنی نجات کا ذریعہ سمجھا اور اس طرح ؏ ـــــ
"کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!" کی صورت پیدا ہو گئی! یہی وجہ ہے، کہ اس علاقے کے مسلمانوں نے اوّلاً ۱۸۵۷ء میں انگریز کی مدد کی اور ان ہی کی مدد سے انگریزوں نے دوبارہ دہلی کو فتح کیا اور ثانیاً انگریز کے 'ثقافتی انقلاب' کا دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ ہی دلی آمادگی سے خیرمقدم کیا اور ان کے دلوں میں انگریز کے خلاف نفرت وبغاوت کے وہ جذبات کبھی پیدا نہ ہو سکے جو بقیہ ہندوستان کے اُن مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوئے جن سے انگریز نے براہِ راست حکومت چھینی تھی!

ہندوؤں کی جانب سے انتقامی طرزِ عمل کا اندیشہ

مزید غور کیا جائے تو نظر آتا ہے، کہ

ہندوستان کی مسلمان قوم کا المیہ دوہرا تھا : اس لیے کہ جہاں ایک جانب انگریز کی غلامی کے نتیجے میں اُن کی غیرت وحمیت، ہمت و عزیمت اور خودی و عزتِ نفس کے سوتے خشک ہو رہے تھے وہاں دوسری جانب اُن ابنائے وطن کے دلوں میں اُن کے خلاف نفرت و انتقام اور بغض و عداوت کے جذبات پروان چڑھ رہے تھے۔ جن پر انہوں نے ہزار سال سے زائد عرصہ تک حکومت کی تھی۔ نفرت و انتقام کے اس جذبہ کو اوّلین شہ تو اگرچہ بیرونی استعمار ہی سے ملی تھی لیکن بعد ازاں یہ خود ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا تھا اور اس کی جڑیں زمین میں بہت گہری اُتر گئیں تھیں اور آزادیٔ ہند سے متصلاً قبل تو یہ جذبہ نفرت و انتقام ایک خوفناک عفریت کی مانند چنگھاڑتا ہُوا بڑھتا نظر آ رہا تھا! —— اس سب پر مستزاد یہ کہ مسلمانانِ ہند اپنے ابناءِ وطن کے مقابلے میں تعداد کے اعتبار سے تو ایک چوتھائی تھے ہی، تعلیم و تنظیم اور سرمایہ و وسائل کے اعتبار سے بھی بہت پیچھے تھے —— نتیجتہً ایک شدید خوف اور سراسیمگی کی حالت اُن پر طاری ہو گئی تھی!

پاکستان کا معجزانہ قیام اور معجزے کا اصل سبب

ان حالات میں واقعہ یہ ہے کہ برِصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کی اکثریت کا بیک وقت انگریزوں کی بالفعل موجود اور ہندوؤں کی ممکنہ و قابلِ حذر غلامی سے نجات پاکر ایک آزاد اور خود مختار ملک کا مالک بن جانا اور دنیا کے نقشے پر وقت کی عظیم ترین مسلمان مملکت کا دفعتہً ظہور ہرگز ایک معجزے سے کم نہ تھا اور یہ معجزہ بھی، جیسے کہ ہم انشاء اللہ بعد میں تفصیلاً واضح کریں گے صرف ایک ہی واقعہ کے معجزانہ ظہور کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے متذکرہ بالا "سلسلۂ معجزات" کے مانند متعدد معجزات کا مجموعہ ہے!

آگے بڑھنے سے پہلے اِس سوال کا جواب بھی سامنے آ جانا چاہیئے کہ یہ معجزہ کیوں رونما ہُوا؟

جن لوگوں کی نگاہیں "يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" (الروم: ۷)

کے مصداق صرف ظاہر تک ہی محدود رہتی ہیں اور جن کا غور و فکر حیاتِ دنیوی اور نظامِ کائنات گویا آفاق و انفس کے ضمن میں صرف مادّی اسباب و عِلَل اور ان کے نتائج و عواقب ہی تک محدود رہتا ہے انہیں تو شاید یہ بہت دُور کی کوڑی نظر آئے لیکن جو اِس نظامِ عالم کے 'باطن' سے بھی کسی قدر شناسا ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ پورا سلسلۂ اسباب ایک مُسبّب الاسباب تبارک و تعالیٰ کے ارادہ و مشیّت کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا ہے۔ وہ اگر قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات پر غور کریں تو اس حقیقت کو پالیں گے کہ یہ اللہ عزّ و جلّ کی سنّت ثابتہ رہی ہے کہ جب کوئی فرد اور بالخصوص کوئی قوم اللہ سے کوئی وعدہ کرتے ہوئے کسی چیز کا سوال کرتی ہے تو اللہ اُسے وہ چیز عطا فرما کر ایک موقع ضرور عنایت فرماتا ہے کہ وہ اپنے قول کی صداقت اور وعدے کی سچّائی ثابت کر سکے۔

قومی و اجتماعی سطح پر تو اس سنّت اللہ کی جانب واضح اشارہ تاریخ بنی اسرائیل کے ضمن ہی میں موجود ہے۔ چنانچہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۲۹ میں حضرت موسیٰؑ کا یہ قول نقل ہُوا ہے:

"عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝"

(ترجمہ) "قریب ہے کہ تمہارا ربّ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں زمین میں خلافت عطا فرما دے — اور پھر دیکھے کہ تم کیا روش اختیار کرتے ہو!"

اور شخصی و انفرادی سطح پر منافقین مدینہ کے ایک گروہ کے رویّے کے ضمن میں اِس سنّت اللہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ کی آیات ۷۵ و ۷۶ میں مذکور ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّا

(ترجمہ) "اُن میں سے بعض وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے (دولت) عطا فرمائے گا تو ہم خوب خیرات کریں گے

اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ٥"

اور لازماً نیک لوگوں میں سے ہوجائیں گے پھر جب اللہ نے اُن کو اپنے فضل سے نوازا تو انہوں نے اس میں بخل کیا اور رُخ موڑ لیا پہلو تہی کرتے ہوئے!"

خوب اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ قیامِ پاکستان کا **معجزہ** بھی اسی سُنّت اللہ کے تحت ظاہر ہُوا۔ اِس لیے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کے عوامی اور جذباتی دَور میں جو ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء دُو سالوں پر مشتمل ہے پورا برِصغیر از درّۂ خیبر تا راس کماری اور از مکران تا چاٹگام اِس نعرے سے گونج اٹھا تھا کہ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا اِلٰہ اِلّا اللہ!" اور تحریک کے زعماء و عمائد کے صریح اور ببانگِ دہل اعلانات و بیانات پر مستزاد جمعہ اور عیدین کے عظیم اجتماعات میں کروڑوں مسلمانوں نے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں کیں تھی۔ اور عہد کیا تھا کہ اے اللہ! ہم اِس دوہری غلامی سے نجات پاکر صرف تیرے بندے بن کر رہیں گے اور تیرے اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دین پر عمل پیرا ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ اسی عہد و میثاق کا نتیجہ تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے حالات کا رُخ بدل گیا، کایا پلٹ کر رہ گئی اور زنجیریں کٹتی چلی گئیں۔ بقول اقبالؔ :-

" غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں!"

قیامِ پاکستان کے بعد کا طرزِ عمل

ملّتِ اسلامیہ پاکستان کا آزادی کے بعد کا طرزِ عمل بھی حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں کے طرزِ عمل سے بہت مشابہ و مماثل ہے۔ نتیجتاً جس صورتِ حال سے وہ دوچار ہوئے اور جس کیفیت میں وہ تاحال مبتلا ہیں وہ بھی نہ صرف بنی اسرائیل کے مشابہ و مماثل بلکہ بعض اعتبارات سے اُن سے بھی بدتر اور مایوس کن ہے!

موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی آزمائش تو بڑی کڑی تھی اِس لیے کہ انہیں ملک

کے حصول کے لیے جنگ کی دعوت دی گئی تھی جس پر اُن کی کئی سو سالہ غلامی کے اثرات کا ظہور 'بزدلی' کی صورت میں ہُوا۔ یہاں بغیر جنگ و قتال کے وسیع و عریض خطّوں پر مشتمل ایک عظیم الشان مملکت عطا فرما دی گئی تھی اور اب صرف اپنے قول کی صداقت اور وعدہ کی سچائی ثابت کرنے کی ضرورت تھی لیکن افسوس کہ یہاں دو صد سالہ غلامی کے اثرات کا ظہور 'وعدہ خلافی' کی صورت میں ہُوا — اور ملّتِ اسلامیہ پاکستان بحیثیتِ مجموعی اپنی تمام وعدوں اور التجاؤں اور درخواستوں اور عرضداشتوں کو بھلا کر اور کُل عہد و میثاق اور قول و قرار کو فراموش کر کے آزادی کے مادّی ثمرات اور دنیوی انعامات سمیٹنے کے ضمن میں تکاثر و تنافس اور مقابلہ و مسابقت کی دَوڑ میں مگن ہی نہیں گم ہو کر رہ گئی — چنانچہ یہاں سزا بھی دوہری ملی :

بے یقینی اور بے مقصدیت کا صحرائے تیہہ

ایک بے یقینی، اور بے مقصدیت کے صحرائے تیہہ، میں سرگردانی کی کیفیت جس کی شدّت میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا اور تا حال ہو رہا ہے — یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ پاکستان دو لخت ہُوا اور نہ صرف یہ کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے علیحدہ ہُوا بلکہ اُس نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا اور اس طرح گویا اپنے تعارف و تشخص ہی کو بدل ڈالا اور اپنے ماضی سے کم از کم وقتی طور پر بالکل لاتعلقی اختیار کر لی — اور یہ بھی اسی کا مظہر ہے کہ تا حال یہ دونوں خطّے ملکی، قومی اور سیاسی و دستوری سطح پر عدمِ توازن اور عدمِ استحکام کا شکار ہیں اور فانی کے اس شعر کا مصداق کامل بنے ہُوئے ہیں کہ :— "ہم تو فانی جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا"

یا اس شعر کا کہ — سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

جس کی منطقی انتہا یہ ہے کہ :—

"نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم!"

چنانچہ ایک طرف اپنا حال یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کے اغراض و مقاصد ہی بحث و نزاع

کاموضوع اور اختلاف و انتشار کا عنوان بنے ہوئے ہیں اور اس ضمن میں بزرگوں کے پیدا کردہ انتشارِ ذہنی کا نتیجہ یہ ہے کہ نئی نسل حیران و پریشان ہے کہ 'پاکستان کیوں معرضِ وجود میں آیا تھا؟' اور 'آیا اس قافلۂ ملی کی کوئی منزلِ مقصود تھی بھی یا نہیں جس نے پاکستان حاصل کیا؟' ـــــ بلکہ یہاں تک کہ 'آیا تقسیمِ ہند کا کوئی جواز تھا بھی کہ نہیں!' ـــــ نتیجتہً ملی و قومی سطح پر ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں چنانچہ زعماء و قائدین اور اصحابِ فکر و دانش تک کی سعی و جہد اور تگ و تاز کا حال اس مصرع کا مصداق ہے کہ ؎ "آہ! وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!" تو بے چارے عوام کا کیا قصور اگر وہ اس شعر کے مصداق کامل بن گئے ہوں کہ ؎

"چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ   پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں!"

اور اس صورتِ حال کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ ریاست کے دستورِ اساسی کے اعتبار سے اپنی عمر کے چالیسویں سال میں بھی 'سلطنتِ خداداد پاکستان' ـــ "ہنوز روزِ اوّل است" کا نقشہ پیش کر رہی ہے اور اس شعر کی مصداقِ اتم ہے کہ : ؎

"اِس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں اِس فکر میں غنچے سوکھ گئے
آئینِ گلستاں کیا ہوگا؟ ـــ دستورِ بہاراں کیا ہوگا؟"

اور دوسری طرف اغیار پھبتیاں چُست کر رہے ہیں۔ چنانچہ کوئی کہتا ہے کہ پاکستان تاحال کسی تشخص کی تلاش میں ہے [1] اور کوئی فیصلہ صادر فرما دیتا ہے کہ پاکستان اپنا جواز کھو چکا ہے [2] اور کوئی اس سے بھی آگے بڑھ کر فیصلہ کُن انداز میں پیشگوئی کر دیتا ہے کہ پاکستان ٹوٹنے ہی والا ہے اور اس کے حصے بخرے ہونے ہی والے ہیں۔ [3]

نفاقِ عملی اور پستیٔ کردار

دوسری سزا جس سے ملّتِ اسلامیہ پاکستان اس وقت دوچار ہے وہ یہ کہ معدودے چند افراد کو

---

[1] "(PAKISTAN IS STILL IN SEARCH OF AN IDENTITY.)"

[2] "(PAKISTAN HAS LOST ITS RATIONALE)"

[3] PAKISTAN IS AT THE VERGE OF DISINTEGRATION OR FURTHER BALKANISATION

چھوڑ کر پوری قوم 'نفاقِ عملی' کی اُس کیفیت میں مبتلا ہو چکی ہے جس کا نقشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اِن احادیثِ مبارکہ میں سامنے آتا ہے:

۱۔ "عن ابی ھریرة رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اٰیۃ المُنافِق ثلاثٌ: زاد مسلمٌ، وان صامَ وصَلّٰی و زَعَمَ انّہٗ مسلمٌ ثُمَّ اتّفقا: اِذا حدّثَ کَذَبَ واِذا وَعَدَ اَخْلَفَ واِذا اؤْتُمِنَ خانَ"

(ترجمہ) "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "منافق کی نشانیاں تین ہیں"۔ یہاں امام مسلم رح نے مزید الفاظ روایت فرمائے ہیں کہ "خواہ وہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو" اس کے بعد بخاری رح اور مسلم رح کے متفق علیہ الفاظ ہیں کہ "جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے اور جب امانت کا حامل بنایا جائے خیانت کا ارتکاب کرے۔" (بخاری رح و مسلم رح)

۲۔ وعن عبد اللہ ابن عمرو رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اَرْبَعٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ کَانَ مُنافِقاً خَالِصاً وَمَنْ کانت فیہ خصلۃٌ منھُنّ کانتْ فیہ خَصْلَۃٌ مِنَ النِّفاقِ حَتّٰی یَدَعَھَا: اِذَا[1] اؤْتُمِنَ خَانَ واِذَا[2] حَدَّثَ کَذَبَ واِذَا[3] عَاھَدَ غَدَرَ واِذَا[4] خَاصَمَ فَجَرَ" (متفق علیہ)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "چار باتیں جس شخص میں موجود ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی اس میں اسی کی نسبت سے نفاق ہوگا۔ یہاں تک کہ اُسے چھوڑ دے: جب[1] امانت کا حامل بنایا جائے خیانت کا ارتکاب کرے، جب[2] بات کرے جھوٹ بولے، جب[3] عہد کرے تو بے وفائی کرے اور

جب کسی سے) جھگڑے تو آپے سے باہر ہو جائے۔"

چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ ہم قومی و ملی سطح پر اخلاق کا دیوالہ نکل جانے کی کیفیت (MORAL CRISIS) سے دوچار ہیں۔ آٹے میں نمک کی حیثیت کے حامل افراد کو علیحدہ رکھتے ہوئے واقعہ یہ ہے کہ قومی اور اجتماعی سطح پر صداقت و امانت اور شرافت و مروّت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اور ایفاء عہد اور پاسِ امانت کا دُور دُور تک نشان نہیں ملتا۔ انفرادی اعتبار سے خالص خود غرضی اور عریاں مفاد پرستی کا دور دورہ ہے اور قومی مصالح اور ملی مفادات سے کسی کو کوئی غرض نہیں رہی، معاملات میں بدعہدی اور بددیانتی بلکہ باضابطہ مکاری اور چالبازی کی گرم بازاری ہے۔ تجارت اور لین دین میں دھوکے اور فریب سے بھی بڑھ کر کھانے پینے کی چیزوں حتّٰی کہ ادویات تک میں ملاوٹ گویا معمولی بات بن کر رہ گئی ہے۔ سرکاری محکموں اور دفتروں میں رشوت ستانی کا بازار تو گرم ہے ہی باضابطہ اذیت رسانی اور لوگوں کی عزّتِ نفس کو مجروح کرنا تفریح اور مشغلے کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور معاشرتی اور سماجی سطح پر سنگدلی اور سفاکی نے ڈیرے جما لیے ہیں تو سیاسی و حکومتی سطح پر بھی جھوٹ اور وعدہ خلافی نے 'ORDER OF THE DAY' کی صورت اختیار کر لی ہے اور ہر سوچنے سمجھنے والا اور حساس شخص حیران و پریشان ہے کہ ؎

" یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین؟ پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!"

نفاقِ عملی کا سبب اور اس کا قابلِ حذر انجام

(نفاقِ عملی کی یہ کیفیت جس کا ہلکا سا نقشہ سطور بالا میں کھینچا گیا ہے براہِ راست نتیجہ ہے اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی خلاف ورزی کا۔ چنانچہ اس سے قبل سورۂ توبہ کی آیات ۷۵، ۷۶ کے حوالے سے نفاق کی جس خاص قسم کا ذکر ہوا ہے اُس کے بارے میں آیت نمبر ۷۷ میں صراحت موجود ہے کہ یہ بدعہدی کی سزا کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

" فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ (ترجمہ) " تو اللہ نے سزا کے طور پر اُن

قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَا اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝"

کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا اُس دن تک کے لیے جب وہ اس کے حضور حاضر ہوں گے بہ سبب اس کے کہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی اور بوجہ اس جھوٹ کے جو وہ بولتے تھے!"

اِس آیۂ مبارکہ میں ایک لرزہ طاری کر دینے والی وعید بھی ہے کہ "یہ نفاق اب اس دن تک قائم رہے گا جس دن یہ لوگ اللہ کے حضور میں پیش ہوں گے" ـــــ اس پر قیاس کرتے ہوئے ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں یاس اور نا اُمیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے نگاہوں کے سامنے چھا جاتے ہیں ـــــ اور اس ضمن میں اس سے بھی بڑھ کر لرزہ انگیز ہے اِسی سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر ۱۱۰، وَهِيَ هٰذِهٖ :

" لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ "

(ترجمہ) (نفاق کی) جو عمارت ان لوگوں نے تعمیر کر لی ہے اب یہ ان کے دلوں میں شکوک و شبہات کی صورت میں ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اِلّا یہ کہ اُن کے دل (خود) ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔"

اور اس سے ذہن بے اختیار منتقل ہو جاتا ہے اُن متذکرہ بالا پیشگوئیوں کی طرف جو پاکستان کے مستقبل کے بارے میں دنیا کے بہت سے سیاسی تجزیہ نگار کر رہے ہیں کہ یہ اپنی یک جہتی اور سالمیت کو برقرار نہیں رکھ سکے گا اور مستقبلِ قریب میں مزید حصّے بخرے ہونے کے عمل (BALKANISATION) سے دوچار ہو جائے گا۔

(اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اَعِذْنَا مِنْ ذٰلِكَ ! اے اللہ! اے ہمارے رب! ہمیں اس انجام سے بچا اور اپنی پناہ میں رکھ!)

الغرض! بے یقینی اور بے مقصدیت کے دھندلکوں پر انفرادی اور اجتماعی اخلاق

کے اس دیوالہ پن اور نفاقِ عملی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں نے بالکل "ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ[1]" کی کیفیت پیدا کردی ہے اور ملک وملت کے مستقبل کو نہایت تاریک بنا کر رکھ دیا ہے اور حالات وواقعات کے اِس 'صغریٰ' کو قوموں کے عروج و زوال کے ضمن میں قدرت کے اٹل اصولوں اور اسباب وعلل اور عواقب ونتائج کے باہمی لزوم کے 'کبریٰ' کے ساتھ جوڑ کر قیاس کیا جائے تو حاصل سوائے مایوسی اور نا اُمیدی کے اور کچھ نہیں بنتا ــــ اور حساب کتاب کے کسی بھی قاعدے سے اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔

پاکستان کی عمر کا چالیسواں سال

اور اُمّید کی ایک کرن

یاس و نومیدی کی اِس شدّت کے عالم میں، حال ہی میں، راقم الحروف کے شعورِ باطنی کے پردے پر، چالیس سال کی مدّت کے حوالے سے اُمید کی ایک کرن جگمگائی ہے اور اس اچانک انتقالِ ذہنی نے کہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان نے اپنی عمر کے چالیسویں سال میں قدم رکھ دیا ہے۔ تاریخ بنی اسرائیل کے متذکرہ حوالے کے ناطے میرے نہاں خانۂ قلب میں اُمید کا ایک چراغ روشن کردیا ہے۔ اور اس خیال نے زور باندھا ہے کہ ہماری بھی وہ نئی نسل جو قیامِ پاکستان کے بعد آزادی کی فضا میں پیدا ہوئی اور آزادی ہی کی فضا میں پروان چڑھی، تا آنکہ اب شعوری پختگی کی عمر کو پہنچ چکی ہے اور اگرچہ فی الوقت اپنے بزرگوں کے پیدا کردہ انتشارِ ذہنی وفکری کے باعث "زوالِ علم وعرفان" سے بھی دوچار ہے اور بزرگوں ہی کی کوتاہیٔ عمل اور نقضِ میثاق سے پیدا شدہ صورتِ حال کی بنا پر اخلاقی اور عملی اعتبار سے

---

[1] سورۂ نور آیت نمبر ۴۰ ۔ ترجمہ " اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اوپر تہہ بر تہہ!"

بھی قابلِ رشک حالت میں نہیں ہے ـــــ تاہم غلامی کے منحوس اثرات سے بہ حال محفوظ رہی ہے لہٰذا غیرت و حمیت اور جرأت و ہمت کے اعتبار سے یقیناً پچھلی نسل سے بہتر حالت میں ہے اور نہ "ندرتِ افکار" سے بالکل تہی دست ہے نہ جرأتِ کردار" سے محرومِ محض ـــ اگر کسی طرح اُسے بھُولا ہُوا سبق یاد دلا دیا جائے اور اُس منزل کی از سرِ نو نشاندہی کر دی جائے جس کے حصول کے لیے آج سے نصف صدی قبل برِصغیر پاک و ہند کی ملّت اسلامیہ نے سفر کا آغاز کیا تھا تو کیا عجیب کہ ملّت اسلامیہ پاکستان کی عمر کا یہ چالیسواں سال ایک فیصلہ کُن موڑ (TURNING POINT) کی حیثیت حاصل کر لے اور ع "کبھی بھُولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو" کے مصداق بے یقینی اور بے مقصدیت کے 'صحرائے تیہہ' میں بھٹکنے والا یہ قافلہ بھی از سرِ نو مقصد و منزل کا سُراغ پا کر ایک عزمِ تازہ اور ولولۂ نَو کے ساتھ ـــ ع "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا" کی شان سے سرگرمِ سفر ہو جائے! ـــ !!

میرے دل میں دفعتہً جگمگانے والی اُمید کی اِس روشنی کو بھی تقویت حاصل ہوئی ہے قرآنِ حکیم ہی کے ایک مقام سے جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو حکم ہُوا ہے کہ لوگوں کے کان کھول دیں اور ڈنکے کی چوٹ فرما دیں کہ اگر تم اپنے اعراض و انکار کی موجودہ روش پر قائم رہے تو عذابِ الٰہی لازماً آ کر رہے گا۔ اگرچہ میں یہ نہیں جانتا کہ وہ گھڑی آیا ہی چاہتی ہے اور عذاب بالکل تمہارے سروں پر آ چکا ہے یا ابھی کچھ دُور ہے اور حکمتِ خداوندی اور مشیتِ ایزدی میں ابھی تمہارے لیے کچھ مزید مہلت باقی ہے ـــ

اِرشاد ہوتا ہے:

"فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ط وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ۝"	(ترجمہ) پھر اگر وہ روگردانی کریں تو آپ صاف کہہ دیں کہ میں نے تم سب کو برابر خبردار کر دیا ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ جس (عذابِ الٰہی) کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ بالکل قریب ہے یا ابھی
(الانبیاء : ۱۰۹)	

کسی قدر) دُور ہے۔"

اور ——

" وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○"
(ایضاً : ۱۱۱)

(ترجمہ) "اور مَیں نہیں جانتا شاید کہ یہ (مہلت) تمہارے لیے مزید ایک آزمائش — اور ایک وقت متعین تک مزید فائدہ اٹھا لینے کا موقع ہو!"

گویا عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ابھی ملّتِ اسلامیہ پاکستان کو بھی مزید مہلت عطا کرے اور اصلاحِ احوال اور تلافیٔ مافات کا ایک اور موقع عنایت فرمائے تاآنکہ وہ صورت پیدا ہو جائے کہ :

" لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۔"
(الانفال : ۴۲)

(ترجمہ) "تاکہ جسے مرنا ہے وہ مرے (لیکن) قیامِ حجت کے بعد اور جسے جینا ہے وہ جئے (لیکن) حجت (اور بصیرت) کے ساتھ!"

لیکن اِس کے لیے لازم ہے کہ حقائق کا جرأت کے ساتھ سامنا کیا جائے، ماضی کا بے لاگ جائزہ ہو اور گذشتہ ناکامیوں اور نامرادیوں کے اَسباب و عِلَل کا بھرپور اور امکانی حد تک معروضی تجزیہ کیا جائے اور اس کے ضمن میں نہ کسی کے ادب واحترام کو حائل ہونے دیا جائے نہ کسی کی محبت اور عقیدت کو آڑے آنے دیا جائے، پھر حال کے عوارض وامراض کی صحیح اور گہری تشخیص کی جائے اور اس سارے مواد کو سامنے رکھ کر ایک حقیقت پسندانہ لائحہ عمل تیار کیا جائے! اور پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا جائے!

چنانچہ اسی مقصد کے تحت راقم الحروف نے پیشِ نظر تحریر کو سپردِ قلم کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اور خاص اسی مقصد کے لیے اُس نے حجازِ مقدس کا سفر اختیار کیا

اور اللہ کا شکر ہے کہ آج ۲ر صفر المظفر ۱۴۰۶ھ کو بمقام طائف اِس طویل تحریر کا دمقدمہ، مکمل ہوگیا۔

اللہ گواہ ہے کہ اِس سے نہ کسی کی دل شکنی و دل آزاری مقصود ہے نہ کسی کی توہین و تنقیص، اور نہ کسی گذری ہوئی شخصیت پر سب و شتم مطلوب ہے نہ کسی حاضر و موجودہ شخصیت کی کردار کشی! بلکہ مقصود صرف اور صرف اصلاح ہے، اپنی امکانی حد تک!

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ (ہود : ۸۸)

(ترجمہ) میرا کوئی ارادہ نہیں ہے سوائے اصلاح کے، جس حد تک میرے امکان میں ہو، اور نہیں حاصل ہے مجھے کوئی توفیق مگر صرف اللہ ہی کے سہارے۔

تتمہ

دو باتیں اچانک یاد آئیں:

ایک یہ کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ و قدس سرہٗ العزیز کے بعد جن علماءِ کرام کو پاک و ہند میں شہرت حاصل ہوئی، اُن میں سے جامع معقول و منقول واقفِ ظاہر و باطن اور جامع شریعت و طریقت ہونے کے اعتبار سے اہم ترین اور منفرد ہستی، یعنی مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ نے اپنی یگانۂ روزگار تالیف "النبیّ الخاتم" (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آنحضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں یوم طائف کو 'فیصلہ کن موڑ' (TURNING POINT) قرار دیا ہے۔ کیا عجب کہ اس تحریر کے اِس سرزمین پر سپردِ قلم کیے جانے کے پس پردہ بھی کوئی راز ہو!

وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ : ۲۱۶)

(ترجمہ) "اور اللہ (ہر چیز) جانتا ہے جبکہ تم (کچھ بھی) نہیں جانتے!"

دوسری یہ کہ آج سے ٹھیک بیس سال قبل نومبر ۱۹۶۵ء میں والدِ مرحوم کے انتقال (بتاریخ ۱۱ نومبر) سے پیدا شدہ رنج اور صدمے سے نڈھال ہو کر طبیعت کی بحالی کے لیے راقم نے وادیٔ کاغان کا سفر اختیار کیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر راقم ایبٹ آباد میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر مقیم تھا کہ اچانک خیال آیا کہ آج ۲۶ نومبر ہے گویا بڑے بھائی صاحب کی اُنتالیسویں سالگرہ یا عمر فانی کے چالیسویں سال کا پہلا دن! اِس پر ذہن بے اختیار سورۂ احقاف کی محولہ بالا آیت نمبر ۱۵ کی جانب منتقل ہُوا اور مَیں نے بھائی جان کے نام وہیں سے ایک خط ارسال کیا جس میں اِس آیت مبارکہ کو 'ہدیۂ اخلاص' کے طور پر پیش کیا۔ (بعد ازاں مَیں نے اِس آیت مبارکہ کی خوبصورت کتابت کرائی اور اسے 'میثاق' میں بھی ایک سے زائد بار شائع کیا اور بہت سے رفقاء و احباب کو بھی جو چالیس سال کی عمر کے لگ بھگ ہوتے تھے، ہدیۃً پیش کیا)

آج ٹھیک بیس سال بعد راقم اِس آیت مبارکہ کو ملتِ اسلامیہ پاکستان کی خدمت میں اُس کی عمر کے چالیسویں سال کے آغاز کے موقع پر پیش کر رہا ہے ؏

"گر قبول افتد زہے عزّ و شرف!"

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

طائف: ۲ر صفر المظفر ۱۴۰۶ھ

چند ذاتی وضاحتیں

آگے بڑھنے سے قبل دو باتیں بطور تمہید عرض کرنی ہیں جن کی حیثیت 'ذاتی وضاحتوں' (POINTS OF PERSONAL EXPLANATION) کی ہے :

پہلی یہ کہ میرے بارے میں یہ بات عام طور پر بھی مشہور ہے اور خود میں نے بھی اس کا بارہا اظہار کیا ہے کہ میں معروف معنی اور مروّجہ مفہوم کے اعتبار سے ہرگز ایک سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ چنانچہ میں نے جو دو تنظیمی ہیئتیں قائم کی ہیں اُن میں سے ایک یعنی انجمن خدام القرآن کے بارے میں بھی سب جانتے ہیں کہ وہ ایک خالص علمی و تعلیمی اور تدریسی و تربیتی ادارہ ہے جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اس تعلیم و تدریس اور نشر و اشاعت کے ضمن میں بھی اُس کا کُل مرکز و محور قرآنِ حکیم ہے۔ پھر اس کا نام خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہ کوئی سیاسی جماعت تو کیا سرے سے جماعت ہی نہیں ہے بلکہ محض ایک انجمن (SOCIETY) ہے اور اس کی سرگرمیوں کا مظہر اتم 'قرآن اکیڈمی' ہے، جو معروف معنی میں صرف ایک 'ادارہ' (INSTITUTION) ہے ـــــ اسی طرح 'تنظیم اسلامی' کے نام سے میں نے جو جماعت قائم کی ہے وہ اگرچہ محدود معنی میں انجمن یا ادارہ نہیں ہے بلکہ باضابطہ 'جماعت' ہے لیکن اس کا بھی یہ پختہ فیصلہ ہے کہ وہ کبھی ملکی انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ لہٰذا یہ بھی مروّجہ مفہوم کے اعتبار سے سیاسی جماعت نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ مارشل لاء کے ساڑھے آٹھ سالہ دَور میں نہ اس پر کوئی پابندی لگی نہ اس کی سرگرمیوں پر کوئی روک ٹوک ہوئی۔

اِس پس منظر میں جب پیشِ نظر تحریر میں بعض سیاسی امور پر تفصیلی گفتگو

لوگوں کے سامنے آئے گی تو اِس سے ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو 'تضاد' — (CONTRADICTION) کا احساس ہو۔

اِس کا اصل سبب یہ ہے کہ 'سیاست'، اگرچہ فی الاصل ایک نہایت وسیع مفہوم کی حامل اصطلاح ہے لیکن پوری دنیا میں بالعموم اور ہمارے یہاں بالخصوص اس کا ایک ہی محدود مفہوم رائج ہے۔ یعنی انتخابات میں حصّہ لے کر حکومت کے حصول یا اُس پر اثر انداز ہونے کی کوشش۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ پوری دنیا میں یہ امر مسلّم ہے کہ صحافت سیاست کا اہم ترین شعبہ ہے۔ اِس لیے کہ یہ رائے عامّہ کو ایک خاص رُخ پر ہموار کرتی ہے جس کا براہِ راست اثر انتخابات پر پڑتا ہے تاہم مروّجہ معنی میں صحافیوں کو سیاسی آدمی کہیں بھی قرار نہیں دیا جاتا۔ اِس اشکال کو اس طرح بآسانی حل کیا جاسکتا ہے کہ 'سیاست' کو دو شعبوں میں منقسم سمجھا جائے: ایک نظری یا بالواسطہ سیاست اور دوسرے عملی یا براہِ راست سیاست، ان میں سے جہاں تک مؤخرالذکر یعنی عملی سیاست کا تعلّق ہے اس نے عہدِ حاضر اور بالخصوص مغربی ممالک میں ایک پیشہ (PROFESSION) کی حیثیت اختیار کر لی ہے لہٰذا یہ ہر شخص کے کرنے کا کام نہیں ہے بلکہ صرف پیشہ ور سیاستدانوں کی جولانگاہ ہے لیکن جہاں مقدّم الذکر یعنی نظری سیاست کا تعلّق ہے تو کم از کم نظری اعتبار سے یہ ہر باشعور انسان کے لیے لازمی ہے اس لیے کہ ملک اور قوم کے معاملات پر غور و فکر اور ان کو درپیش مسائل کے لیے سوچ بچار اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے دامے، درمے، سخنے کوشش ہر باشعور شہری کا فرضِ عین ہے۔ اور اس سے اغماض و اعراض یقیناً ملک اور قوم سے بدعہدی اور بے وفائی کے مترادف ہے۔ یہ نظری یا بالواسطہ سیاست کس قدر اہم اور مؤثر بلکہ فیصلہ کن ہو سکتی ہے اُس کا اندازہ ماضی قریب میں یورپ کے ممالک اور زمانۂ حال میں امریکہ میں یہودیوں کے عمل دخل سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگرچہ اپنی تعداد کی قلّت کے باعث وہ براہِ راست عملی سیاست میں دخیل نہیں ہو سکتے لیکن ذرائع ابلاغ پر اپنے قبضہ و تسلّط کے ذریعے وہ امریکہ جیسے

عظیم ملک کی سیاست کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بقول اقبال ؏

"فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!"

مزید غور کیا جائے تو عملی سیاست کے بھی دو مختلف انداز ممکن ہیں: ایک کو 'انتخابی سیاست' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور دوسرے کو 'انقلابی سیاست' سے۔ ان دونوں کے مابین حدِ فاصل اس طرح قائم ہوتی ہے کہ اگر کسی انسان کے نزدیک اُس کے ملک میں قائم معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام (POLITICO-SOCIO-ECONOMIC SYSTEM) بحیثیتِ مجموعی اور اپنی جڑ بنیاد کے اعتبار سے صحیح ہے تو ملک اور قوم کی بہتری کے ضمن میں صرف ایک کام باقی رہ جاتا ہے کہ اُس نظام کو چلانے کے لیے بہتر سے بہتر ہاتھ فراہم کیے جائیں اور اس میں زیادہ سے زیادہ کچھ جزوی اور فروعی پالیسیوں کے ضمن میں اختلاف واقع ہو سکتا ہے، اِس صورت میں ضرورت صرف اس کی ہو گی کہ 'انتخابی سیاست' میں حصّہ لے کر صرف 'حکومت' کی تبدیلی کی کوشش کی جائے ـــــ اس کے برعکس اگر کسی کے نزدیک ملک میں بالفعل قائم و رائج نظام بحیثیتِ مجموعی غلط اور بلحاظ اساسِ نظری باطل (FALSE) اور باعتبارِ تشکیلِ عملی یا مبنی بر امتیازات (DISCRIMINATIVE) ہے، یا ظالمانہ اور متشددانہ (UNJUST AND SUPPRESSIVE) ہے یا استحصالی (EXPLOITATIVE) ہے، تو اس کے لیے مسئلہ صرف 'حکومت' کی تبدیلی کا نہیں ہو گا بلکہ پورے نظام کی تبدیلی کا ہو گا جس کے لیے انتخابی سیاست قطعاً غیر مفید اور بالکل لاحاصل ہے۔ اس کے لیے اصلاً ایک انقلابی عمل درکار ہو گا جسے ہم 'انقلابی سیاست' سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں!

الحمدللہ کہ گذشتہ نصف صدی کے دوران بہت سے اربابِ دانش اور اصحابِ قلم کی کاوش و محنت کے نتیجے میں یہ حقیقت تو کم از کم تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے بالکل نکھر کر آ چکی ہے کہ اسلام صرف ایک 'مذہب' نہیں بلکہ ایک کامل 'دین' ہے اور اس میں جہاں 'مذہب' کے جملہ معروف اجزاء یعنی 'عقائد' عبادات اور بعض معاشرتی رسومات موجود ہیں وہاں انسان کی اجتماعی زندگی کے وہ تینوں گوشے بھی شامل ہیں جن کو موجودہ دنیا میں عام طور پر

حیاتِ انسانی کے 'لادینی میدان' (SECULAR FIELD) سے تعبیر کر دیا جاتا ہے یعنی ایک مکمل اور متوازن معاشرتی نظام، ایک عادلانہ اور منصفانہ معاشی نظام اور ایک مساویانہ اور حرّیت پرور سیاسی نظام ــــ اب اگر واقعہ یہ ہے کہ سیاست اسلام کا جزو ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی باشعور مسلمان، خالص 'غیر سیاسی' ہو

علّامہ اقبال مرحوم نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا ع "جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" راقم کے نزدیک ان الفاظ میں بھی، غالباً وزن و بحر کی مجبوریوں کے باعث، حقیقت کی تعبیر میں کسر رہ گئی ہے۔ اس لیے کہ اس سے محسوس یوں ہوتا ہے کہ جیسے سیاست کوئی بالاتر اور عظیم تر حقیقت ہے اور دین اُس کا ایک جزو جبکہ واقعہ یہ ہے کہ کم از کم اسلام کی حد تک اصل بالا و برتر اور جامع و غالب حقیقت 'دین' ہے اور 'سیاست' محض اس کا ایک شعبہ اور جزو ہے جو تمام تر دین کے 'تابع' ہے ــــ البتہ اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ شعبہ یا جزو بھی ہرگز نہ غیر اہم ہے نہ حقیر! اس لیے کہ ایک حدیث نبوی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کے مطابق سابقہ اُمّتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل میں سیاست کی پوری ذمہ داری خود انبیاء کرام علیہم السّلام کے کندھوں پر رہی ــ "کَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ تَسُوْسُھُمُ الاَنْبِیَاءُ" (رواہ مسلم) ــــ

ــــ اور خود نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں مغربی مفکّرین اور مصنّفین میں سے بعض نے فی الواقع تحسین و ستائش کے انداز میں اور بعض بدبختوں نے ہجو ملیح کے انداز میں تسلیم کیا ہے کہ آپؐ نہایت ماہر اور عظیم سیاستدان (STATESMAN) تھے۔ چنانچہ عہدِ حاضر کے مشہور ترین عالمِ فلسفۂ تاریخ ٹائن بی (TYONBEE) نے تو آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی کامیابی کا سہرا ہی تمام تر آپؐ کی سیاستدانی (STATESMANSHIP) کے سر باندھا ہے (ورنہ ــــ نقل کفر کفر نہ باشد ــــ اُس کے نزدیک بحیثیت نبی تو آپؐ ناکام ہو گئے تھے باؔ)

ؔ ("Mohammad failed as a Prophet but succeeded as a Stateman!")

اسی طرح پروفیسر منٹگمری واٹ نے بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاستدانی، امورِ حکومت کی واقفیت و مہارت، معاملہ فہمی و موقع شناسی، دُور اندیشی و پیش بندی، انتظام و انصرام اور پیشگی اہتمام اور بروقت اقدام کو شاندار خراجِ تحسین ادا کیا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اِس ضمن میں تحسین و ستائش کا کوئی لفظ اور اسلوب ایسا نہیں رہا جو اُس نے استعمال نہ کر لیا ہو۔ اگرچہ اُس نے بھی نہایت لطیف (SUBTLE) انداز میں 'مکہ والے محمدؐ' ("MOHAMMAD AT MECCA") اور 'مدینہ والے محمدؐ' ("MOHAMMAD AT MADINA") کے مابین تضاد (CONTRAST) پیدا کر کے ایک ہجو ملیح کی صورت پیدا کی ہے۔ اس ضمن میں غالباً سب سے زیادہ سچائی، اور راست بازی کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر جامع اور حقیقت سے نزدیک ترین انداز ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کا ہے جو انہوں نے اپنی تالیف "THE 100" میں اختیار کیا ہے۔ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نسلِ آدم کی عظیم ترین شخصیت قرار دینے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ آپؐ نسلِ انسانی کی واحد شخصیت ہیں جو بیک وقت مذہب اور سیاست کے دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب ہیں!"[1]

بنا بریں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی باشعور اُمتی کے لیے یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ خالص غیر سیاسی انسان ہو۔ چنانچہ الحمدللہ کہ شعوری زندگی کے آغاز سے لے کر آج تک راقم کی زندگی میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں آیا جو خالص غیر سیاسی حالت میں گذرا ہو۔ ایک ہائی اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے میں نے اپنی بساط کے مطابق تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا، پھر ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء جماعت اسلامی کی تحریک سے عملاً منسلک رہا۔ جبکہ جماعت مروّجہ معنی کے اعتبار سے بھی ایک سیاسی جماعت قرار

---

[1] "My choice of Mohammad to lead the world's most influential persons may surprise some reader and may be questioned by others, but he was THE ONLY man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels".

('The 100' page 33.)

پا چکی تھی۔ اس سے علیحدگی اختیار کی تو اسی بنیاد پر کہ پاکستان میں اسلام انتخابی سیاست کے ذریعے نہیں بلکہ صرف انقلابی عمل کے ذریعے قائم کیا جا سکتا ہے — اور وہ دن اور آج کا دن میری توانائیوں اور صلاحیتوں حتیٰ کہ میرے اوقات کا بھی بہتر اور بیشتر حصہ "اسلامی انقلاب، کے اساسی لوازم" (BASIC PREREQUISITES) ——— کی تکمیل کی سعی و جہد میں صرف ہوا ہے — اور اس دوران میں بھی میں نے کم از کم نظری فکری سطح پر وقتی سیاست میں بھی بھرپور حصہ لیا ہے۔ چنانچہ تحریر اور تقریر دونوں کے ذریعے امکانی حد تک قوم اور ملک کو درپیش مسائل کے ضمن میں اپنی رائے کے اظہار میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

قصہ مختصر یہ کہ میں خالص غیر سیاسی آدمی کبھی بھی نہیں رہا — اگرچہ مروجہ انتخابی سیاست کے میدان سے ضرور کوسوں دور بھاگتا ہوں۔

دوسری تمہیدی وضاحت یہ کہ میرے بارے میں یہ بات بھی بالعموم معلوم و مشہور ہے کہ ماضی میں میرا نہایت گہرا تعلق جماعتِ اسلامی کے ساتھ رہا ہے۔ چنانچہ خود میں نے بھی نہ صرف یہ کہ کبھی اسے چھپایا نہیں بلکہ بارہا اس کا ڈنکے کی چوٹ اور علیٰ رؤس الاشہاد اعتراف و اعلان کیا ہے کہ اگرچہ میرے شعور کی سب سے زیریں اور تحتانی سطح پر تو نقش ہیں علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی ملّی شاعری کے اثرات تاہم میرے ذہن اور فکر کی تفصیلی تشکیل میں سب سے زیادہ دخل جماعت اسلامی کے دینی فکر اور مولانا مودودی مرحوم و مغفور اور مولانا امین احسن اصلاحی کی تصانیف کو حاصل ہے — اُدھر جماعتِ اسلامی کا تحریکِ پاکستان سے تعلق ایک اختلافی اور نزاعی مسئلہ ہے اور اگرچہ جماعت کے زعماء و عمائدین بہت زور دے کر کہتے ہیں کہ جماعت کبھی پاکستان کی مخالف نہیں رہی بلکہ بعض سادہ لوح بزرگ تو اس سے بڑھ کر یہ دعویٰ بھی کر گذرتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے ضمن میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بعد سب سے بڑھ کر حصہ مولانا مودودی کا ہے۔ لیکن عام طور پر یہ بات تسلیم نہیں کی جاتی اور ان دعووں کی یا تو شدّت کے ساتھ تردید کی جاتی ہے — یا کم از کم انہیں مسکرا کر یا ہنس کر ٹال

دیا جاتا ہے۔

اِس ضمن میں فی الوقت مَیں اس بحث کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ اصل معاملہ کیا ہے بلکہ صرف یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ تقسیم ہند سے قبل میرا جماعتِ اسلامی کے ساتھ کوئی عملی تعلق نہیں تھا بلکہ مَیں اپنی عمر اور بساط کے مطابق عملاً تحریکِ پاکستان ہی کا ایک ادنیٰ کارکن اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا ورکر اور عہدیدار تھا۔ اور اگرچہ مَیں اُس وقت بھی اپنے محدود فہم کی حد تک جماعتِ اسلامی کی تحریک اور مولانا مودودی کے فکر سے متعارف ہو چکا تھا۔ اور مجھے اُس کے ساتھ ایک گونہ اتفاق اور کسی قدر ہمدردی بھی تھی۔ چنانچہ جب مسلم لیگ اور فیڈریشن کے حلقوں میں جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی پر تنقید ہوتی تھی تو مَیں اُن کی جانب سے اپنے اِمکان بھر مدافعت بھی کرتا تھا لیکن میرا عملی تعلق کُل کا کُل تحریکِ مسلم لیگ اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن ہی کے ساتھ تھا!—

اِس سلسلے میں مَیں بعض واقعات کو ریکارڈ پر لے آنا مناسب سمجھتا ہوں۔ میرا بچپن مشرقی پنجاب (اور اب بھارت کے موجودہ صوبہ ہریانہ) کے ایک ضلع 'حصار' میں گذرا ہے۔ جو متحدہ پنجاب کے پسماندہ ترین اضلاع میں سے تھا۔ اور جس کا اکثر و بیشتر حصّہ کچھ عرصہ قبل دریائے گھگھر کے خشک ہو جانے کے بعد صحرا کی صورت اختیار کر چکا تھا اور میری یادداشت کے مطابق پورا ضلع اکثر قحط و خشک سالی کا شکار رہتا تھا اور اس کی بنا پر آفت زدہ علاقہ (CALMITY STRICKEN AREA) —— قرار دیا جاتا تھا[1]

---

[1] ایک زمانے میں جب پاکستان میں پیپلز پارٹی اور دوسری سیاسی جماعتوں میں کشمکش عروج پر تھی بھٹو صاحب کے خاندانی حالات کے ضمن میں بھی یہ تحقیق سامنے آئی تھی کہ اُن کے آباء اجداد کا تعلق بھی ضلع حصار ہی سے تھا اور اُن کے خاندان نے سندھ کی جانب نقلِ مکانی دریائے گھگھر کے خشک ہو جانے پر جو صورتِ حال پیدا ہوئی اسی کی بنا پر کی تھی۔ خود مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حصار کے ضلعی صدر مقام یعنی حصار شہر اور اس کے ایک اہم تحصیل ہیڈ کوارٹر اور نہایت قدیمی قصبے سرسہ کے مابین میٹر گیج ریلوے لائن پر عین درمیان میں ایک اسٹیشن 'بھٹو' نامی آتا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ اس کا نام اب بھی وہی ہے۔ یا بدل دیا گیا ہے۔

چنانچہ حکومت کی طرف سے تقاوی قرضوں کی صورت میں کاشت کاروں کی مدد کا سلسلہ تقریباً ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ تعلیمی اعتبار سے بھی پورے ضلع کی پسماندگی کا عالم یہ تھا کہ اُس کے طول و عرض میں کالج صرف ایک تھا اور وہ بھی قصبہ بھوانی کے مالدار بنیوں کا قائم کردہ ہندو قومی کالج! پورے ضلع میں ہائی سکول بھی میرے اندازے کے مطابق آٹھ دس سے زیادہ نہیں ہوں گے جن میں دو تین ہندوؤں کے قومی اسکول تھے بقیہ سب گورنمنٹ اسکول تھے ـــــ پورے ضلع میں اسلامیہ ہائی سکول نام کی کوئی شئے موجود نہ تھی۔ چنانچہ حصار ڈسٹرکٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن بھی کُل کی کُل ہائی سکول کے طلبہ پر مشتمل تھی اور میں نویں جماعت کے طالب علم کی حیثیت سے اُس کا جنرل سیکرٹری تھا، اور نہ صرف یہ کہ اپنے قصبے یعنی حصار میں اس کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا بلکہ اکثر سرسہ اور ہانسی کے قصبات کے دوروں پر بھی جاتا رہتا تھا ـــــ اس ضمن میں اہم ترین واقعہ یہ کہ ۱۹۴۶ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا جو تاریخی جلسہ منعقد ہوا تھا جس سے قائدِ اعظم مرحوم نے خطاب فرمایا تھا اُس میں ضلع حصار کے دو مندوبین میں سے ایک میں تھا (دوسرے دسویں جماعت کے طالب علم عبدالواحد تھے، جن کے بارے میں اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں) مجھے خوب یاد ہے کہ اس موقع پر ہمارے قیام کا انتظام میکلوڈ روڈ کے لکشمی چوک سے متصل ایک ہوٹل میں کیا گیا تھا جس کے اور میکلوڈ روڈ کے مابین ایک خالی پلاٹ تھا جس میں بانسوں کا بہت بڑا اسٹاک تھا ـــــ اگر فیڈریشن کا اُس دور کا ریکارڈ کہیں محفوظ ہو تو اس میں اُس اجلاس کے ضلعی مندوبین کی حیثیت سے شرکت کرنے والے طلبہ کے پاسپورٹ سائز کے فوٹو جو پہلے ہی طلب کر لیے گئے تھے ضرور موجود ہوں گے اور اُن میں ایک تصویر اس خاکسار کی بھی ہوگی!

قصہ مختصر یہ کہ قبل از آزادیٔ ہند جماعتِ اسلامی کا تحریکِ پاکستان کے ساتھ تعلق مثبت تھا یا منفی، اس سے قطع نظر راقم کو اس پر فخر ہے کہ تحریکِ پاکستان کے ننھے کارکنوں میں اس کا نام بھی شامل ہے اور یہ کیسے نہ ہوتا جبکہ راقم کے شعور کی سب سے زیریں اور تحتانی سطح پر، جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، سب سے گہرے اور انمٹ نقوش ثبت

تھے۔ علامہ اقبال مرحوم کی قلی شاعری کے ۔

ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دوں کہ پاکستان میں آزادی کے بعد سے اب تک جو حالات رونما ہوئے اُن کی بنا پر کبھی کبھی مایوسی کی شدت کے عالم میں دوسرے بہت سے لوگوں کے مانند میرے ذہن و شعور کے سامنے بھی یہ سوالیہ نشان اُبھرا کہ پاکستان کا قیام درست اقدام تھا بھی کہ نہیں؛ لیکن الحمدللہ کہ ہمیشہ صورت یہ رہی کہ جب بھی میں نے ازسرِنو صغریٰ کبریٰ جوڑ کر حساب لگایا۔ نتیجہ یہی برآمد ہُوا کہ پاکستان کا قیام صحیح اور درست تھا یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں ہم سے اجتماعی سطح پر کوتاہی کا صدور ہُوا جس کی سزا ہمیں پہلے بھی بھگتنی پڑی اور تا حال بھی بھگتنی پڑ رہی ہے!

اِس ضمن میں یادش بخیر، پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی مثال بہت اہم ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ علامہ اقبال کے معاجین اور تحریکِ پاکستان کے شعلہ بیان مقررین میں نہایت اہم مرتبہ و مقام کے حامل تھے۔ اور خود اُن کے قول کے مطابق قائدِ اعظم سے اُن کا قریبی تعلق تھا اور اُن کے اور متعدد مسلمان والیانِ ریاست کے مابین نجی پیغام رسانی اور چندوں کی رقوم کی ترسیل کا ذریعہ وہ تھے ۔۔۔ اِسی طرح از پشاور تا پونا جہاں بھی کبھی کوئی انتخابی معرکہ گرم ہوتا تھا اُن کو طلب کیا جاتا تھا۔ اُن کی لیگیت، کی شدت کا اندازہ اسی واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو خود انہوں نے بیان فرمایا کہ ایک موقع پر سیالکوٹ کے کسی دینی جلسے میں وہ بھی بحیثیت مقرر مدعو تھے اور مولانا سید حسین احمد مدنی رح بھی ۔۔۔ اور اتفاقاً دونوں کا قیام کسی ایک ہی مکان میں تھا۔ مولانا مدنی رح کو جب معلوم ہُوا کہ چشتی صاحب بھی وہیں پر مقیم ہیں تو انہوں نے چشتی صاحب کو پیغام بھجوایا کہ وہ ان سے ملاقات کے خواہشمند ہیں، لیکن اس پر چشتی صاحب کا جواب یہ تھا کہ میرے اور آپ کے راستے بالکل جُدا بلکہ متضاد سمت میں ہیں لہٰذا میں آپ سے ملاقات میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا ۔۔۔ لیکن یہی پروفیسر یوسف سلیم چشتی پاکستان میں پیش آمدہ حالات و واقعات سے اس درجہ مایوس اور دل گرفتہ ہوئے کہ ۱۹۶۶ء کے بعد سے تو میں خود گواہ ہوں کہ اپنے انتقال کے وقت تک وہ برملا اِس رائے کا اظہار

کرتے رہے کہ ع "مری تعمیر میں مُضمر تھی اِک صورت خرابی کی! " کے مصداق پاکستان کا قیام ہی غلط تھا ـــــ اور یہ کہ " ہم نے مسلم لیگ کا ساتھ دے کر جھک ماری اور بھاڑ جھونکا"۔ میرا کیونکہ پروفیسر صاحب مرحوم کے ساتھ بھی گہری نیازمندی کا تعلق رہا ہے بلکہ منظرِ عام سے ایک طویل عرصہ کی 'غیبوبت' کے بعد پبلک پلیٹ فارم پر اُن کا ظہور میری ہی قائم کردہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی سالانہ کانفرنسوں کے ذریعے ہوا۔ اور مجھے اس اعتراف میں بھی کوئی باک نہیں ہے کہ مَیں نے ان کے علم وفضل اور خصوصاً اُن کے وسیع خزانۂ معلومات سے بہت استفادہ کیا اور اُن کے لیے میرے دل میں آج بھی ادب اور احترام بلکہ احسانمندی کے جذبات پوری شدّت کے ساتھ موجود ہیں ـــــ تاہم قیامِ پاکستان کے ضمن میں اُن کی رائے کی تبدیلی اور اُس میں اس قدر شدّت میری رائے میں ہرگز درست نہیں تھی بلکہ اُن کے مزاج کی اسی جذباتیت اور حساسیت کا مظہر تھی جو بالعموم شدّتِ اخلاص کا نتیجہ ہوتی ہے! ـــــ البتہ مولانا حسین احمد مدنی رح کی شان میں اپنے مزاج کی اسی جذباتیت کے باعث جن گستاخیوں کا ارتکاب اُن سے مسلم لیگ کے ساتھ عملی وابستگی کے دوران ہوگیا تھا اُن پر اُن کی پشیمانی اور توبہ و استغفار یقیناً درست تھا۔ اس لیے کہ محض سیاسی اختلاف پر کسی کے خلوص و اخلاص پر حملہ کرنا بالخصوص مولانا مدنی رح ایسی عظیم دینی و رُوحانی شخصیت کی شان میں گستاخی کا ارتکاب یقیناً بہت بڑی غلطی تھی ـــــ چنانچہ اس موضوع پر اُن کی ایک طویل تحریر جسے مولانا مدنی رح کے حلقۂ ارادت سے تعلق رکھنے والے جرائد بھی شائع کرنے میں متأمل و متردد تھے اوّلاً مَیں نے ہی 'میثاق' میں شائع کی تھی!

پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب پر تو قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات و واقعات کی بنا پر مایوسانہ ردِّ عمل کی کیفیت مستقل طور پر قائم ہوگئی تھی۔ تحریکِ پاکستان کے مخلص اور بے لوث کارکنوں میں ایسی اور بھی بہت سی مثالیں لازماً موجود ہوں گی۔ لیکن جہاں تک مختلف مواقع پر عارضی مایوسی اور بددلی کا تعلق ہے تو اس کی مثالیں تو بے شمار ہیں۔ چنانچہ پاکستان کے پہلے اور آخری شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح

سے بھی بہت سے مایوسانہ اقوال منسوب کیے جاتے ہیں، اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مرحوم کے عہدِ حکومت میں فروری ۱۹۶۸ء میں عید کے چاند کے ضمن میں جو اختلاف اور اس سے پیدا شدہ ہنگامہ آرائی برپا ہوا تھا، اُس کے موقع پر خود راقم نے مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم ایسے کٹر مسلم لیگی کی زبان سے یہ الفاظ جامعہ اشرفیہ لاہور کے ایک اجتماع میں سُنے تھے کہ "اب جو حالات پیش آرہے ہیں انہیں دیکھ کر تو خیال ہوتا ہے کہ غالباً اُن علماءِ کرام کی رائے زیادہ درست اور صائب تھی جو قیامِ پاکستان کے خلاف تھے!"

اِس ضمن میں ہر اعتبار سے 'آخری' مثال پروفیسر مرزا محمد منوّر کی ہے جو از سرتاپیر از ظاہر تا باطن اور از اوّل تا آخر خالص مسلم لیگی اور پاکستانی ہیں، ۷۰/۱۹۶۹ء میں جو حالات و واقعات پاکستان میں رونما ہوئے اُن سے وہ بھی اس درجہ مایوس اور دلگیر ہوئے کہ انہوں نے ایک فارسی غزل لکھی جس کا عنوان ہی یہ تھا کہ: ؎

"کہ رہوارِ یقینِ ما بہ صحرائے گماں گم شد!"

اِس غزل کو راقم نے اوّلاً اگست ۱۹۷۰ء کے 'میثاق' میں شائع کیا تھا اور بطور قندِ مکرر دوبارہ ۱۹۸۲ء میں یعنی ٹھیک بارہ سال بعد شائع کیا۔ اپنی اس غزل پر ایک تعارفی نوٹ بھی مرزا صاحب نے خود اپنے قلم سے تحریر فرمایا تھا ـــــ ملاحظہ ہو:

"غزل کا پس منظر سیاسی ہے۔ برِّصغیر تقسیم ہُوا۔ بڑی نیک خواہشات کے ساتھ مسلم قوم نے تقسیم کی تحریک کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ مگر بوجوہ نتائج حسبِ تمنّا برآمد نہ ہوئے۔ جب بھی کوئی بہتری کی صورت پیدا ہوتی ساتھ ہی ساتھ کوئی خرابی بھی در آتی۔ اے کاش! قائدِ اعظم کی طرح کا کوئی "مردِ امین" پھر مل جاتا" ـــــ منوّر"

غزل خاصی طویل تھی لیکن اُس کا لبِّ لباب اِن اشعار میں سامنے آجاتا ہے کہ ؎

"چہ دارد سعیِ ما سُودے نمی یابیم مقصودے
کہ برگ و خس بیاورد یم و شاخِ آشیاں گم شد!

خنک روزے بود یا بیم اگر خضرِ ہدایت را
کہ رہوارِ یقینِ ما بہ صحرائے گماں گم شد[۱] !!"

الغرض! ملّتِ اسلامیہ پاکستان گذشتہ ۳۸، ۳۹ سالوں کے دوران صحرائے تیہہ میں بھٹکنے کی جس کیفیت سے دوچار رہی ہے اُسی کی بنا پر بہت سے مخلص لوگوں کے دلوں پر تو مایوسی کے شدید اندھیارے مستقل طور پر مسلط ہو گئے جس کے نتیجے میں وہ شدید ردِّ عمل کا شکار ہو کر رہ گئے! اور بہت سے دوسرے لوگوں کے دلوں پر مختلف مواقع پر عارضی طور پر بددلی کی کیفیت طاری ہوتی رہی جس کے منحوس اثرات سے وہ اپنے آپ کو بدقّتِ تمام ہی بچا سکے؟ —— اور ان مؤخّر الذکر لوگوں میں ان سطور کا عاجز و حقیر راقم بھی شامل ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ کبھی تو ملّتِ اسلامیہ پاکستان ہی نہیں موجودہ پوری عالمی اُمّتِ مسلمہ کے مستقبل سے شدید مایوسی ہو جاتی ہے اور ایسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ شاید سات آٹھ صدیوں بعد تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرانے والی ہے اور ؎

"ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!"

کے مصداق قدرت ایک بار پھر پوری موجود اُمّتِ مسلمہ کو "رد" کر کے دین کا جھنڈا کسی نئی قوم کے ہاتھوں میں تھمانے والی ہے —— کبھی پھر اُمید کا دامن ہاتھ میں آجاتا ہے اور اللہ کے فضل و کرم سے بہتری کی توقع قائم ہو جاتی ہے! اب بھی حقیقت یہ ہے کہ جب بھی نگاہ حالات و واقعات کی جانب اُٹھتی ہے مایوسی اور نااُمیدی کی شدت کے باعث اُمید کا دامن ہاتھ سے بالکل ؏ "کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!"

---

[۱] ہماری سعی و کوشش کا کیا حاصل! کہ پوری کوشش کے باوجود ہم اپنے مقصود کو حاصل نہیں کر پاتے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ہم آشیانہ بنانے کے لیے تنکے اور پتے جمع کرتے ہیں تو اس شاخ ہی کو گم پاتے ہیں جس پر آشیانہ تعمیر کرنا تھا۔

وہ دن کتنا دلفریب ہوگا جب ہمیں کوئی خضرِ ہدایت میسّر آئے گا کیونکہ اب تو حال یہ ہو گیا ہے کہ ہمارے یقین کا رہوار صحرائے گماں میں گم ہو چکا ہے۔

کی سی کیفیت کے ساتھ چھوٹتا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن جب ذہن ارادہ و مشیئت ایزدی کے مظہر خرقِ عادت واقعات کی ایک مسلسل زنجیر کی جانب منتقل ہوتا ہے تو اُمید کے نئے چراغ دل میں روشن ہو جاتے ہیں اور محسوس ہونے لگتا ہے کہ پاکستان کا ظہور اسلام کے اُس عالمی غلبے کی خدائی تدبیر کے طویل سلسلے کی اہم کڑی ہے جس کی خبر جناب صادق و مصدوق صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دی تھی!

گویا ـــــ اِن سطور کا ناچیز راقم اپنے شعور کے بالکل آغاز ہی سے 'پاکستانی' ہے ـــــ اور عارضی اور وقتی طور پر پے بہ پے مایوسیوں اور نا امیدیوں سے دوچار ہونے کے باوجود آج بھی پاکستان کے تابناک مستقبل اور شاندار تقدیر ـــــ (DESTINY) پر یقین رکھتا ہے! اگرچہ ـــــ ظاہر ہے کہ ـــــ اُس منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ملّتِ اسلامیہ پاکستان اور بالخصوص اُس کی نوجوان نسل کو شدید محنت و مشقت اور پیہم جدّ و جہد کرنی ہوگی اور سخت ابتلا و امتحان اور ایثار و قربانی کے مراحل طے کرنے ہوں گے۔ بقولِ حضرتِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ؎

بقدر الکدِّ تکتسبُ المعالی
ومن طلب العلیٰ سَہر اللّیالی
ومن طلب العلیٰ من غیر کدٍّ
اضاع العُمرَ فی طلب المحالِ

(جاری ہے)

ooo

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
انا امرکم بخمس	میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم
بالجماعۃ والسمع	دیتا ہوں التزامِ جماعت کا
والطاعۃ والھجرۃ	اور سننے اور اطاعت کرنے کا
والجھاد فی	اور اللہ کی راہ میں ہجرت
سبیل اللہ	اور جہاد (جدّ و جہد) کرنے کا

آئندہ چار ماہ کے دوران

تنظیم اسلامی کے تحت اہم اجتماعات کی تفصیلات

(۱)

۱۵ روزہ تعلیمی و تربیتی پروگرام

تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع ۸۶ء سے قبل قرآن اکیڈمی لاہور میں پندرہ پندرہ روز کے دو تربیتی پروگرام منعقد کئے جائیں گے (ان شاء اللہ) تاریخوں کا تعین کیا جا چکا ہے جو حسب ذیل ہیں:

i۔ پہلا تربیتی پروگرام: ۷۔ فروری تا ۲۱۔ فروری ۸۶ء

ii۔ دوسرا تربیتی پروگرام: ۲۱۔ مارچ تا ۳۔ اپریل ۸۶ء

(۲)

پانچواں سہ روزہ علاقائی اجتماع تنظیم اسلامی

پچھلے سالانہ اجتماع کے بعد سے اب تک تنظیم اسلامی کے تحت چار علاقائی اجتماعات منعقد کئے جا چکے ہیں اور اب اس سلسلے کا پانچواں اجتماع

ملتان میں ، ۲۳۔ تا ۲۵۔ فروری ۸۶ء

منعقد ہوگا ۔ ان شاء اللہ

(۳)

سالانہ اجتماع تنظیم اسلامی

تنظیم اسلامی کے مرکزی سالانہ اجتماع کے لئے امسال

۴۔ اپریل ۸۶ء بروز جمعۃ المبارک تا ۶۔ اپریل ۸۶ء

کی تاریخوں کا تعین ہوا ہے۔ تنظیم کے تمام رفقاء نوٹ فرمالیں!

المعلن: چوہدری غلام محمد ، قیم تنظیم اسلامی

الھُدیٰ

نشست ۲۹

(مباحثِ ایمان)

حظِّ عظیم

سورہ حٰمٓ السجدہ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

(کے ٹیلیویژن پر نشر شدہ دروس کا سلسلہ)

(۱)

السلام علیکم - نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم - اما بعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ   بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۚ وَلَکُمْ فِیْہَا مَا تَشْتَہِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْہَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ۝

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ـــ (آیات: ۳۰، ۳۱، ۳۲)

" یقیناً جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جم گئے - ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (اور وہ کہتے ہیں) کہ نہ خوف کھاؤ نہ غمگین

ہو - بلکہ خوش خبری حاصل کرو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا - ہم ہیں تمہارے پشت پناہ - دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی - اور اس (جنت) میں تمہیں ملے گا جو کچھ چاہیں گے تمہارے جی اور وہاں مہیا کر دیا جائے گا جس کی تم طلب کرو گے - یہ مہمان نوازی ہوگی اُس ہستی کی طرف سے جو غفور بھی ہے رحیم بھی ہے"۔ (سچ فرمایا اللہ بزرگ و برتر نے)

محترم ناظرین اور معزز سامعین - !

ان آیاتِ مبارکہ میں اوّلاً تو ایمان کا جو لبِّ لباب ہے، جو اس کا اصل حاصل ہے، اسے نہایت مختصر الفاظ میں بیان کر دیا گیا: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ - پھر اس ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے صرف ایک لفظ لایا گیا استقامت - جس پہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس لفظِ استقامت میں قیامت مضمر ہے - یہ بات ان مجالس میں اس سے پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ ایمان اگرچہ بہت سے امورِ غیبی کے ماننے کا نام ہے - اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات، اس کی توحید، ملائکہ، وحی، انبیاء، رسل، کتابیں، بعثِ بعد الموت، حشر و نشر، حساب کتاب، وزنِ اعمال، جزا و سزا، جنت و دوزخ ان تمام باتوں کو ماننے کا نام ایمان ہے - ان ایمانیات کو ہم تین بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کرتے ہیں - ایمان باللہ یا توحید، ایمان بالمعاد یا ایمان بالآخرہ اور ایمان بالرسالت - لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایمان کی جڑ اور بنیاد ایمان باللہ ہے - جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ ایمان مجمل میں صرف ایمان باللہ کا ذکر ہے: "اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ - پھر ایمان باللہ کے بھی بہت سے پہلو ہیں - ایک یہ کہ انسان مانے کہ اللہ کی ہستی ہے، اس کا وجود ہے - یعنی اثباتِ وجودِ باری تعالےٰ - ایک یہ کہ اللہ عزّ و جلّ اپنی ذات و صفات میں اکیلا ہے، تنہا ہے، واحد ہے، احد ہے - ایک یہ کہ وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ و بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہے - اس کے اختیار و

حقوق میں کوئی شریک نہیں ہے — لیکن اصل حاصل اور اس کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ربوبیّت کا ملہ پر انسان کا دل ٹھک جائے، جم جائے۔ ربوبیّت کیا ہے؟ ربّ کہتے ہیں پالنے والے کو، پروردگار، پالن ہار، پرورش کنندہ — اور ظاہر بات ہے کہ پھر وُہی مالک ہوگا لہٰذا اس لفظِ ربّ میں مالک ہونے کا مفہوم بھی موجود ہے لیکن اس کا بنیادی مفہوم ہے پالنے والا، روزی رساں، ضروریات بہم پہنچانے والا، ہماری احتیاج رفع کرنے والا، ہماری دُعائیں سننے والا، ہماری تکلیف دور فرمانے والا — یہ وہ امور ہیں کہ جن پر اگر غور کریں گے تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان ہی میں انسان کی کمزوری مضمر ہے۔ انسان اپنی ضروریات اور احتیاجات ہی کی وجہ سے ذلیل ہوتا ہے۔ ان ہی کے لئے انسان کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے۔ کسی کے سامنے اپنی گردن کو خم کرتا ہے، کسی کے سامنے عجز اور تذلّل اختیار کرتا ہے، کسی کے سامنے گڑگڑاتا ہے، کسی کے ساتھ اپنی عزتِ نفس کا سودا کرتا ہے — یہ ساری ذلّتیں انسان گوارا کرتا ہے۔ اپنی ضروریات و احتیاجات کے باعث —

ایمان کا اصل حاصل یہ ہے کہ ان تمام امور کے لئے انسان صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت سے وابستہ ہو جائے۔ اس کا دل اس پر ٹھک جائے اور جم جائے کہ وُہی میرا حقیقی پالن ہار ہے۔ وہی میرا روزی رساں ہے — وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ — حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس طرح نمرود سے فرمایا تھا کہ "میرا رب ہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے" — وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ "جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے" — وہی تمام تکلیفوں کا دور کرنے والا ہے۔ اگر انسان کا دل ان باتوں پر جم جائے، ٹھک جائے تو حقیقی ایمان ہے۔ میں یہ بار بار کیوں کہہ رہا ہوں — اس لئے کہ ان باتوں کو مان لینا اور ہے زبان سے اقرار کر لینا اور ہے لیکن ان باتوں پر انسان کے دل کا ٹھک جانا اور جم جانا

بالکل دوسری بات ہے، ایمان کا اصل حاصل یہ ہے ایمان کا لبِّ لباب یہ ہے جسے یہ کیفیت میسر آگئی ہو یوں سمجھئے کہ ایمان کے حیثیۂ حقیقی سے وُہ واقعتاً بہرہ ور ہوگیا ہے جیسے ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربّاً وّبمحمد رّسولاً وبالاسلام دیناً ۔ " ایمان کی لذت حاصل ہوگئی اس کو، ایمان کا مزا چکھ لیا اس نے، ایمان کی حلاوت محسوس کرلی اس نے، جو مطمئن ہوگیا اور راضی ہو گیا اس بات پر کہ اللہ ہی اس کا رب ہے، محمدؐ ہی اس کے رسول ہیں ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ اور اسلام ہی اس کا دین ہے ۔"

ایک اور حدیث میں یہ بات ایک دوسرے اسلوب سے آتی ہے کہ ایک شخص نے ایک مرتبہ نبی اکرمؐ سے سوال کیا کہ حضورؐ میں زیادہ لمبی چوڑی باتیں نہ سمجھ سکتا ہوں نہ یاد رکھ سکتا ہوں ۔ مجھے تو کوئی ایک بات ایسی تلایئے کہ میں اُسے حرزِ جان بنا لوں اور وہ میرے لئے کافی ہو جائے اب آپ خود سوچیے کہ کتنا مشکل سوال تھا ۔ لیکن یہ سوال کیا گیا تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ۔ حضورؐ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ اوتیت جوامع الکلم " مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہایت جامع کلمات عطا فرمائے گئے ہیں " معانی ومفاہیم کے سمندر کو کوزے میں بند کر دینا، یہ آپ کو نظر آئے گا ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین، فرمودات وارشادات میں ۔ حضورؐ نے اس شخص کے جواب میں ارشاد فرمایا :

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ

" کہو میں نے مانا اللہ کو، میں ایمان لایا اللہ پر اور پھر اس پر جم جاؤ "

یہ اسی آیت کی شرح ہے کہ : اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا

پس ایمان کا لبِّ لباب تو اس قول میں آگیا کہ میرا رب اللہ ہے ،

میں راضی ہوگیا۔ اس پر کہ میرا پروردگار، میرا پالن ہار، میرا روزی رساں، میرا حاجت روا، میرا مشکل کشا، میری تکالیف رفع کرنے والا، مجھے بیماریوں سے شفا دینے والا اللہ ہے۔ اس کے بعد جو لفظ آیا ہے استقامت۔ اس کے بارے میں، میں نے آغاز میں عرض کیا تھا کہ اس لفظ میں قیامت مضمر ہے کہ اس قول پر جم گئے۔ حضور نے فرمایا صلی اللہ علیہ وسلم کہ کہنے کو تو یہ بات بہتوں نے کہی: قَدْ قَالَهَا كَثِيرٌ۔ لیکن اس پر جمے نہ رہ سکے۔ لوگ اس سے پھر گئے۔ اس لئے کہ اس عالم اسباب میں رہتے ہوئے انسان حالات اور واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔ ظاہری اسباب انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس عالم میں سلسلۂ اسباب و علل ہے۔ کچھ کاموں کے کچھ نتیجے نکلتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں کچھ اختیارات ہیں اور وہ انکے ذریعوں سے کچھ لوگوں کے کام کر دیتے ہیں۔ یا وہ چاہیں تو کچھ لوگوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ جب ہم اس طریقہ سے نفع و ضرر کو اسباب ظاہری کے ساتھ بندھے دیکھتے ہیں تو لامحالہ ہم پر ایک اثر مترتب ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ذاتِ باری تعالیٰ سے نگاہیں ہٹ کر ان ظاہری اسباب کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ یہی بات ہے کہ جس کی وجہ سے استقامت میں کمی آگئی۔ جمے رہے۔ مستقیم نہ رہ سکے۔

اس استقامت کو اگر میں تین اجزا میں تقسیم کر کے بیان کروں تو بات واضح ہو جائے گی۔ سب سے پہلے تو استقامتِ قلبی ہے کہ دل جما رہے، دل ٹکا رہے۔ یہ باطنی استقامت ایمان کا اصل جوہر ہے۔ اس قلبی استقامت کا پہلا نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے کہ انسان محسوس کرے کہ اصل مؤثر اور اصل فاعل اللہ ہے۔ بظاہر اسباب ہیں۔ بہت سی چیزیں ہیں کہ جن کے کچھ نتائج نکلتے ہوتے نظر آتے ہیں لیکن اس ظاہر سے دھوکہ نہ کھائیے۔ جیسے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کی ہیں، ان میں بڑے پیارے الفاظ آتے ہیں کہ "اے میرے بچے! اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرلے کہ لا فاعل

فی الحقیقۃ ولا مُؤثّر الّا اللّٰہُ ـــ وہ فاعلِ حقیقی اور مؤثر حقیقی اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ آگ جلاتی ہے لیکن بغیرِ اذن رب نہیں جلاتی۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہیں جلایا۔ سمندر غرق کر دیتا ہے لیکن بغیرِ اذنِ ربّ نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو غرق نہیں کیا۔ انہیں راستہ دیدیا۔ پس اسباب اللہ کے تابع ہیں۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ اللہ اسباب کے تابع نہیں ہے معاذ اللہ ـــ

اس قلبی استقامت کا دوسرا نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے کہ انسان کی تمام امیدیں اور کُل خوف اللہ کی ذات پر مرتکز ہو جائے۔ غیر سے نہ امید رہے نہ خوف رہے۔ جب کسی کے ہاتھ میں کچھ ہے ہی نہیں تو کسی سے کیا توقع! کیا امید باندھی جائے! جب کسی کے ہاتھ میں ہمیں ضرر پہنچانے کا اختیار ہے ہی نہیں تو کسی سے کس بات کا خوف! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے چچا زاد بھائی حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما کو بڑے ہی شفقت اور محبت بھرے انداز میں چند نصیحتیں فرمائیں ـــ امام ترمذیؒ اُسے اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ طویل حدیث ہے جو خود حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ حضورؐ نے انؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: یَا غُلَامُ اِنِّیْ اُعَلِّمُکَ کَلِمَاتٍ: "اے میرے بچے میں تجھے چند باتوں کی تعلیم دے رہا ہوں، تجھے تلقین کر رہا ہوں، انہیں اچھی طرح ذہن نشین کر لو حرزِ جان کر لو"۔ ان نصیحتوں میں یہ کلمات بھی ہیں :

وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّۃَ لَوِاجْتَمَعَتْ عَلٰی اَنْ یَنْفَعُوْکَ لَمْ یَنْفَعُوْکَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ کَتَبَہُ اللّٰہُ لَکَ وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَنْ یَّضُرُّوْکَ بِشَیْءٍ لَمْ یَضُرُّوْکَ اِلَّا بِشَیْءٍ کَتَبَہُ اللّٰہُ عَلَیْکَ

اور خوب جان لو کہ اگر تمام لوگ مِل کر تمہیں کوئی نفع یا فائدہ پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر صرف اس قدر جتنا اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہو ـــ اور اگر سب لوگ مل کر تمہیں کوئی گزند یا ضرر یا

نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر اُسی قدر جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہو۔"

یہ ہے اللہ تعالٰے کی قدرت کی شانِ مطلقہ — وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے۔

بُتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

اس شعر میں آپ تمام اسباب مادّی کو بتوں کی جگہ رکھ لیجئے، یہ فی الواقع بُت ہیں یہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ہمیں ڈراتے ہیں سا اہل ایمان کا رویّہ کیا ہوگا۔ اجن کا قول یہاں نقل ہوا، اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ۔ وہ اُسی وقت سچّے سمجھے جائیں گے جب ان کی تمام اُمیدیں اور تمام خوف صرف اللہ کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو جائیں۔

اس قلبی و باطنی استقامت کا تیسرا نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے کہ توکّل اُسی کی ذات پر ہو۔ اپنی سی کوشش اپنی سی محنت انسان کرے لیکن یہ جان رکھے کہ ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا۔ پھر انسان کے ساتھ جو کچھ پیش آئے اس پر راضی برضائے رب اور تسلیم و رضا کی کیفیت دل میں پیدا ہو۔

یہ تین نتائج اور کیفیاتِ باطنی اگر ہیں تو ایمان پر قلبی استقامت ہے اور اگر یہ نہیں ہیں تو دل کی استقامت موجود نہیں ہے۔ پھر تو یہ محض ایک قول ہے جو ہم اپنی زبان سے کہتے ہیں کہ رَبُّنَا اللّٰہُ۔ لیکن ہمارا دل اس پر ٹھکا ہوا نہیں ہے۔

اس سے آگے چلئے اب عملی استقامت درکار ہے — آپ نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اب آپ کو اس کا ہر حکم ماننا ہوگا۔ اس کے ہر فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔ اور آپ کو معلوم ہے اللہ کی اطاعت رسول کی اطاعت کے واسطہ سے ہوتی ہے: مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ۔

اسی عمل استقامت کی بلند ترین منزل وہ ہے جسے ہم نے پچھلی نشست میں اللہ کے لئے غیرت وحمیت سے تعبیر کیا تھا۔ اللہ کو اپنا رب مانیں اور دین کو پائمال دیکھیں پھر بھی پاؤں پھیلا کر سوئیں۔ آرام سے بال بچوں میں زندگی بسر کریں۔ اللہ کی شریعت کے بارے میں دیکھیں کہ اس کا استہزا ہو رہا ہے۔ اللہ کی حدود کے بارے میں دیکھیں کہ ان کو پاؤں تلے روندا اور کچلا جا رہا ہے اور ہماری حمیت وغیرت جوش نہ کھائے۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں بھی استقامت چاہیئے ـــــ یہاں تک آیت مبارکہ کے اس حصے کی مختصراً تشریح وتوضیح ہوئی کہ: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ـــــ

آگے فرمایا: تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا: "اُن لوگوں پر ـــــــ (جو اللہ کو اپنا رب مان لیں اور اس پر جم جائیں) فرشتوں کا نزول ہوتا ہے (جو کہتے ہیں) کہ تم لوگ نہ خوف کھاؤ اور نہ غمگین ہو" ـــ نزولِ ملائکہ کی کیا صورتیں ہیں جن کا یہاں ذکر فرمایا گیا ہے اس کے متعلق تو میں آگے کچھ عرض کروں گا۔ پہلے یہاں خوف اور حزن کی جو نفی ہو رہی ہے اس کے متعلق جان لیجئے کہ یہ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا کا منطقی نتیجہ ہے۔ جب ساری اُمیدیں اللہ کے ساتھ وابستہ ہوگئیں اور سارے کا سارا خوف صرف اللہ کا رہ گیا۔ ماسوا سے نہ اُمید رہی نہ اس کا خوف رہا۔ تو اب نہ خوف ہے نہ حُزن ـــ جو کچھ ہوا وہ اس لئے ہوا کہ ہمارے رب کو یہی منظور تھا۔ جو ہمارے ربّ کو منظور ہے اس پر ہمیں کسی شکوہ وشکایت کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہمارا رویّہ یہ ہونا چاہیئے کہ ع سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ اگر دل میں شکوہ وشکایت کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قلبی استقامت موجود نہیں ہے ـــ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا تمہارے لئے نہ کوئی خوف ہے نہ حزن ـــ یہی مضمون قرآن مجید میں ایک دوسرے اسلوب سے آیا ہے کہ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

یہاں خوف اور حُزن کی جو نفی کی گئی ہے - یہ آخرت کے بارے میں تو حتمی اور قطعی طور پر ہے ہی لیکن اگر واقعتاً اللہ سبحانہٗ کی ربوبیت پر دل ٹھک گیا ہو تو اس دُنیا میں بھی خوف اور حُزن سے رستگاری حاصل ہو جاتی ہے -

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کیفیاتِ ایمانی میں سے کچھ حصہ نصیب فرمائے - اب جو کچھ اس وقت میں نے عرض کیا ہے اس کے ضمن میں اگر آپ حضرات کو کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں -

---

سوال و جواب

سوال : ڈاکٹر صاحب! جس استقامت کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ اس دور میں دلوں میں کیسے پیدا کی جا سکتی ہے -

جواب : بڑا عملی سوال ہے - ہمیں قرآن مجید کو پڑھتے ہوئے بھی اور اس کے بارے میں کچھ سنتے ہوئے بھی یہ چیز پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ جو عملی تقاضے ہمارے سامنے آ رہے ہیں، ان کو ہم کیسے پورا کر سکتے ہیں — آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ استقامت براہ راست نتیجہ ہے ایمان اور یقین کا — اگر واقعتاً دل میں یقین کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کے نتیجہ میں انسان کے عمل میں استقامت آپ سے آپ پیدا ہو جائے گی - لہٰذا اصل سوال یہ ہے کہ ایمان کیسے پیدا ہو! اس کے بارے میں اس سے قبل بھی ایک مرتبہ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک تو ہے عوام کا معاملہ، ان کے لئے ایمان حاصل کرنے کا مؤثر ترین ذریعہ اصحابِ ایمان و یقین کی صحبت ہے - ان کے پاس بیٹھیں گے - ان کی صحبت اٹھائیں گے تو آپ سے آپ ان کے دلوں میں ایمان و یقین کی کیفیت پیدا ہو جائے گی - لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اصحابِ ایمان و یقین کیسے وجود میں آئیں گے! تو جان لیجئے کہ ان کے لئے ایمان و یقین کا منبع اور سرچشمہ قرآن مجید ہے - بقول مولانا ظفر علی خاں مرحوم ؎

وہ جنس نہیں ایماں جسے لے آئیں دوکان فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو قرآن کے سیپاروں میں

قرآن مخزن ہے، یہ سرچشمہ ہے یہ منبع ہے ایمان و یقین کا - اس کے ذریعہ سے دلوں میں ایمان و یقین پیدا ہوگا جس کے نتیجہ میں آپ سے آپ استقامت پیدا ہو جائے گی -

سوال : ڈاکٹر صاحب! خوف اور غم موجودہ دور کی دو نفسیاتی بیماریاں ہیں، قرآن مجید سے ان کے تدارک اور علاج کے متعلق کچھ وضاحت فرمائیں - ؟

جواب : یہ بھی ہماری موجودہ صورت حال سے متعلق سوال ہے لیکن ہماری آج کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ خوف اور حزن دونوں کا سبب بے یقینی ہے - وہی جواب جو میں نے پہلے سوال کا دیا تھا، اس سوال کا جواب بھی وہی ہوگا۔ بقول علامہ اقبال ؎

یقین پیدا کر اے ناداں یقین سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

خوف اور حزن دونوں کا علاج اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پر اللہ کی صفاتِ کمال پر یقین پیدا کرنے سے ہوگا -

حضرات! ان آیاتِ مبارکہ پر آج کی نشست میں ہم صرف غور کا آغاز کر پائے ہیں - ابھی ہمیں چند اور نشستیں ان آیاتِ مبارکہ پر غور کرنے میں صرف کرنی ہوں گی - یہ ہیں اصل مضامین قرآنِ حکیم کے - یہ وہ بنیادیں ہیں کہ جن پر افکار کی تطہیر اور صحیح اسلامی سیرت و کردار کی تعمیر ممکن ہے لہٰذا انہیں بہت اچھی طرح سمجھ لینا بہت ضروری ہے -

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں - لہٰذا احترام آپ پر فرض ہے - لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں انکو صحیح اسلامی طریقے کیمطابق بیحرمتی سے محفوظ رکھیں -

اسلامی انقلاب : مراحل، مدارج اور لوازم (خطاب ۶)

مسلح تصادم: غزوۂ بدر سے صلح حدیبیہ تک

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد، کا سلسلہ وار خطاب

الحمد للّٰہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الّذین اصطفیٰ خصوصًا علیٰ افضلھم خاتم النبیّین محمد ن الامین وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین ۔

خطبہ کے بعد امیرِ تنظیم نے سورۂ صف کی آیت ۴ و آیات ۸ تا ۱۱ کی تلاوت فرمائی بعدہٗ ادعیہ مسنونہ و ماثورہ پڑھیں اور فرمایا:

حضرات! نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ مطہرہ سے ایک انقلابی عمل کے جن مراحل، مدارج اور لوازم کا میں نے استنباط کیا ہے، ان کا بیان ان اجتماعاتِ جمعہ میں کافی دنوں سے چل رہا ہے۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ پانچ مراحل اب تک زیرِ گفتگو آچکے ہیں جن میں سے چار وہ ہیں جن کا تعلق نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ کے مکّی دور سے ہے۔ آغازِ وحی سے لے کر ہجرت تک کے قریبًا ساڑھے بارہ سال میں یہ مراحل طے پائے ہیں۔ پانچواں مرحلہ وہ ہے جسے میں اقدام (ACTIVE RESISTANCE) سے تعبیر کیا کرتا ہوں اور جو ہجرت کے فورًا بعد سے شروع ہوا اور وہ غزوہ بدر تک چلا جس سے چھٹے مرحلہ یعنی مسلّح تصادم (ARMED CONFLICT) کا آغاز ہوا۔ آگے بڑھنے سے قبل میں چاہوں گا کہ مضمون کا ربط برقرار رکھنے کے لئے سابقہ گفتگو کا ایک خلاصہ آپ کے گوش گزار کر دوں

سابقہ گفتگو کا خلاصہ

مکّی دور کے جو چار مراحل مکمل ہوئے ان میں سے تین مراحل کو میں نے ابتدائی و تمہیدی مراحل قرار دیا ہے اور وہ ہیں دعوت، تنظیم، تربیت۔ ان کے ساتھ ہی صبرِ محض یعنی Passive Resistance کا دور یعنی چوتھا مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ دعوت کے آغاز ہی سے داعیٔ اوّل صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ذہنی اذیت، کوفت اور تمسخر و استہزاء

کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ سلسلہ تین سال تک پورے شدّ و مد کے ساتھ چلا۔ اس عرصہ کے دوران جو سعید روحیں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لائیں، ان پر ان ابتدائی تین سالوں میں کوئی تشدّد اور جور و ستم نہیں ہوا۔ لیکن جب مشرکین و کفارِ مکّہ استہزائی اور تمسخر کے ہتھکنڈوں میں ناکام رہے اور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پائے ثبات و استقامت میں معمولی جنبش بھی پیدا نہ کر سکے اور دعوت بالخصوص نوجوانوں اور غلاموں کے طبقہ میں روز بروز نفوذ کرتی رہی تو اب مشرکین کا فیصلہ ہوا کہ اہلِ ایمان میں سے جس پر جس کا کوئی اختیار ہے یا جس پر بس چلے ان کو مارو، جسمانی تکلیف پہنچاؤ، ان پر مصائب و تشدّد کے پہاڑ توڑ دو۔ چنانچہ ساڑھے آٹھ برس تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ حضرت سمیّہ اور ان کے شوہر حضرت یاسر رضی اللہ عنہما نہایت بہیمانہ اور سفّاکانہ طور پر شہید کر دیئے گئے۔ حضرت خبابؓ اور حضرت بلالؓ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ قریش کے ایک اونچے گھرانے کے فرد تھے۔ دیت کی رقم کے تعین کا منصب آپ کے پاس تھا۔ مکّہ کے نہایت باعزت تاجر تھے۔ ان کو اتنا مارا گیا، اتنا مارا گیا کہ یہ سمجھ کر چھوڑا گیا کہ ان کی جان نکل چکی ہے۔ خود نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر بھی دست درازیاں شروع ہو گئیں۔ حضورؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس طرح بل دیا گیا کہ آنکھیں اُبل پڑنے کو تھیں ــــ ایک مرتبہ عین حالتِ سجدہ میں پشت مبارک پر اونٹ کی غلاظت بھری اوجھڑی لا کر رکھ دی گئی۔ حتیٰ کہ آپ کا اور پورے بنو ہاشم کا چاہے وہ ایمان لائے ہوں یا نہ لائے ہوں معاشرتی مقاطعہ کیا گیا۔ حضورؐ سمیت سب کو شعب بنو ہاشم میں محصور کر دیا گیا۔ قریش کے تمام گھرانوں کے مابین تحریری معاہدہ ہو گیا اور اسے کعبہ شریف کے دروازہ پر لٹکا دیا گیا کہ جب تک یہ معاہدہ موجود ہے بنو ہاشم محصور رہیں گے اور ان کا معاشی مقاطعہ جاری رہے گا۔ تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب اس معاہدہ کو دیمک اور کیڑے چاٹ گئے اور اس طرح اس کا وجود ختم ہوا تب یہ محاصرہ بھی ختم ہوا۔ یہ سب حضورؐ کے ساتھ ہو رہا ہے تو "تا بہ دیگراں چہ رسید" والی بات ہے ــــ اس پورے دور میں مسلمانوں کو حکم تھا کہ ان مصائب و شدائد پر صبر کریں، ان کو جھیلیں، برداشت کریں لیکن ہاتھ نہ اٹھائیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ جور و تعدّی سے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سمیت کوئی اہلِ ایمان بھی محفوظ نہیں رہا۔ ساتھ ہی یہ بھی تربیتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کا کمال بلکہ معجزہ تھا کہ قریباً نو برس تک صحابہ کرامؓ نے یہ مظالم جھیلے لیکن کسی مسلمان کی طرف سے کسی تشدّد پر کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ کسی نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ نہ کوئی اہلِ ایمان اپنے موقف سے ہٹا۔ تمام اہلِ ایمان نے صبر و ثبات اور سمع و طاعت کی وہ نظیر قائم کی جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخِ انسانی تا قیامت عاجز و قاصر رہے گی۔

بہرحال پس Passive Resistance کے دو حصّے تھے۔ پہلے تین سال خود داعیٔ اوّل جنابِ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو زبانی کلامی تمسخر، استہزا، تضحیک کا ہدف بنا کر آپؐ کو ذہنی اذیت و کوفت پہنچانے کی آخری حد تک کوشش کی گئی لیکن جب حضورؐ عزم، صبر و ثبات اور استقامت کے کوہ ہمالیہ ثابت ہوئے اور دعوت برابر نفوذ کرتی رہی تو آپ سمیت تمام اہلِ ایمان کو کسی نہ کسی طور پر قریباً ساڑھے آٹھ برس تک جسمانی تشدد (Physical Persecution) کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن دعوت و تبلیغ اور تربیت و تنظیم کے مراحل بھی ساتھ ساتھ طے پاتے رہے۔ اہلِ ایمان کی تعداد میں اضافہ بھی ہوتا رہا اور اس طرح چاروں مراحل مکّی دور میں اس حد تک تکمیل پا گئے کہ جس کے بعد اقدام کا مرحلہ آ گیا۔ ورنہ دعوت و تبلیغ کا مرحلہ مدنی دور میں بھی جاری رہا۔ تنظیم و تربیت کا سلسلہ مدنی دور میں بھی چلتا رہا۔ پرانوں کی بھی تربیت ہو رہی ہے اور جو نئے لوگ ایمان لا رہے ہیں ان کی بھی تربیت ہو رہی ہے۔ مکہ میں بلکہ اس میں بعض اعتبارات سے وسعت پیدا ہو گئی کہ اب عسکری تربیت اور دو بدو جنگ کے عملی تجربات بھی شروع ہو گئے ــــ دارِ ارقم تھا یہاں مدینہ

میں مسجدِ نبوی تربیت گاہ بھی بن گئی اور دارالشوریٰ بھی۔ حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ اور تنظیم و تربیت کا عمل مدنی دور میں بھی جاری رہا۔ البتہ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہ عمل مکّی دور میں اس حد تک مکمل ہو چکا تھا کہ اب اگلے مرحلہ کی طرف پیشقدمی کر دی جائے یعنی اقدام کی طرف۔

یہ مرحلہ ہجرت کے فوراً بعد یا اس کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جب وہ آیت نازل ہوئی کہ: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ جس کی دوسری قرأت ہے: اَذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتِلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ مفہوم دونوں کا ایک ہے کہ "اے مسلمانو! اب تک تمہارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، اب وہ کھول دیئے گئے ہیں۔ اور اب تمہیں بھی جوابی کارروائی کرنے کی اجازت ہے — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لاتے ہی جو اقدامات فرمائے اس پر میں قدرے تفصیل سے پچھلے جمعہ تقریر کر چکا ہوں[1]۔ پہلے چھ مہینے آپؐ نے داخلی استحکام پر صرف فرمائے اور اس سے فارغ ہو کر حضورؐ نے آٹھ مہمیں قریش کے تجارتی راستوں کو مخدوش کرنے اور اپنی موجودگی (Presence) ظاہر کرنے کے لئے بھیجیں جن میں سے چار میں آپؐ نے بنفسِ نفیس شرکت فرمائی جو غزوات شمار ہوتی ہیں اور چار وہ ہیں کہ جس میں آپؐ خود تشریف نہیں لے گئے بلکہ چار چھوٹے بڑے دستے کسی صحابیؓ کی سرکردگی میں بھیجے جو سرایا کہلاتے ہیں۔ دونوں میں کوئی انصاری صحابی شریک نہیں تھے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ ان مہمات کے نتیجہ میں پوری طاقت کے ساتھ قریش نے Retaliate کیا ہے اور ان کا یہ جوابی اقدام غزوہ بدر پر منتج ہوا ہے — میں پچھلی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ اگر حضورؐ کی طرف سے غزوۂ بدر سے قبل والی آٹھ مہمات نہ بھیجی گئی ہوتیں تو مکہ والے ایک ہزار کا کیل کانٹے سے لیس لشکر لے کر ہرگز اقدام نہ کرتے اس لئے کہ مکہ میں جہاں Hawks (جنگ پسند) تھے۔ وہاں Doves (صلح جو) بھی تھے جو اگرچہ ایمان نہیں لائے تھے لیکن شریف النفس لوگ تھے اور خون ریزی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہی میں سے بعض لوگ بعد میں ایمان بھی لے آئے تھے۔ میں یہ احوال و کوائف گذشتہ تقریر میں قدرے تفصیل سے آپ کو سنا چکا ہوں۔

مشرکین میں سے ابوجہل اور نضر ابن حارث کی وہ دعائیں بھی میں آپ کو سنا چکا ہوں جو انہوں نے غزوۂ بدر کی رات کو اللہ سے کی تھیں۔ ابوجہل کی دعا کا ایک ایک لفظ ایک مخلص قوم پرست شخصیت کی غمازی کرتا ہے۔ اس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے رحمی رشتے کٹوا دیئے ہیں۔ ہمیں پھاڑ دیا ہے۔ ہماری جمعیت کو پراگندہ کر دیا ہے۔ اس کا عملی نمونہ میدانِ بدر میں اس طور پر موجود تھا کہ حمزہؓ حضورؐ کے لشکر کے ساتھ تھے تو ان کے بھائی عباس مشرکین کے ساتھ جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے یا تو ایمان تو لے آئے تھے لیکن ابھی اسے چھپا رکھا تھا۔ باپ عتبہ ابن ربیعہ مشرکین کے لشکر کا سپہ سالار ہے، اس کا ایک بیٹا اور بھائی بھی اس کے ساتھ ہے تو اس کا ایک بیٹا حضرتِ ابو حذیفہؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں میں شامل ہیں یہی صورتحال حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن کی ہے کہ باپ حضورؐ کے معین ہیں اور بیٹا مشرکین و کفار کا ساتھی ہے۔ حضرت علیؓ حضورؐ کے ساتھ ہیں تو انؓ کے بھائی عقیل مشرکین کے ساتھ مقابلہ کے لئے آئے ہیں — یہ تو چند مثالیں ہیں ورنہ قریشی مہاجرینؓ میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا کوئی رشتہ دار مشرکین کے لشکر میں شامل نہ ہو — نضر بن حارث کی دعا تھی: اَللّٰهُمَّ انْصُرْ خَيْرَ الْحِزْبَيْنِ۔ وہ تو اپنی جماعت کو حق پر سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک تو معاذ اللہ

---

[1] شائع شدہ "میثاق" بابت ستمبر/اکتوبر ۸۵ء

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بے دین ہو گئے تھے۔ تو اس نے یہی دھائی دی تھی کہ ان مقابل دو جماعتوں میں سے جو بہتر ہے اسے اللہ تو اس کی مدد فرمایا۔ اللہ نے اس کی دعا قبول فرمائی اور اغلباً میری گذشتہ تقریر اسی جملہ پر ختم ہوئی تھی کہ ان دونوں جماعتوں میں سے جو خیر کی علم بردار تھی اسی کی اللہ نے مدد فرمائی اور غزوۂ بدر کو یوم فرقان قرار دیا

غزوۂ بدر سے متعلق ایک اہم واقعہ

آگے بڑھنے سے قبل غزوہ بدر سے متعلق یہ اہم واقعہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ جب عتبہ ابن ربیعہ نے اس خبر کے بعد کہ ابوسفیان کا قافلہ محفوظ مکہ پہنچ گیا ہے، حکیم ابن حزام کی تجویز پر یہ کوشش کی تھی کہ جنگ ٹل جائے، اس پر ابوجہل نے اسے طعنہ دیا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بیٹا سامنے ہے اسی لئے تمہاری ہمت جواب دے رہی ہے اور محبت پدری کے باعث تم یہ تجویز لے کر آئے ہو کہ جنگ نہ ہو۔ پس یہ طعنہ تھا جو عتبہ کو کھا گیا۔ اور اس طرح صلح جو لوگوں (DOVES) کی جانب سے جنگ کو ٹالنے کی کوشش ناکام ہو گئی۔ چنانچہ اگلی صبح جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو سب سے پہلے عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کو لے کر نکلا اور مبارزت طلب کی۔ اہل ایمان کے لشکر سے تین انصاریؓ صحابی مقابلہ کے لئے نکلے۔ عتبہ نے چیخ کر پوچھا: مَنْ اَنْتُمْ ؟ مِنَ الْقَوْمِ ؟ ـــــ انہوں نے اپنے نام بتائے۔ عتبہ نے کہا کہ تم ہمارے برابر کے نہیں ہو، ہم تم سے لڑنے نہیں آئے۔ پھر چیخ کر پکارا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہماری توہین نہ کرو۔ ہم ان کاشت کاروں سے لڑنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ ہمارے مقابلے کے لئے انہیں بھیجو جو ہمارے برابر کے ہیں، جو ہمارے مدمقابل ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ اس موقع پر باپ کے مقابلہ میں بیٹا یعنی عتبہ کے مقابلے میں حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نکلنا چاہا۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں روک دیا۔ پھر حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ ابن حارث ابن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہم، تین صحابی مقابلہ کے لئے نکلے۔ حضرت حمزہؓ نے عتبہ کو اور حضرت علیؓ نے شیبہ کو جلد ہی واصل جہنم کر دیا لیکن حضرت عبیدہؓ کا ولید ابن عتبہ سے شدید مقابلہ ہوا۔ دونوں کا بیک وقت ایک دوسرے پر کاری وار ہوا۔ حضرت عبیدہ کی ٹانگیں کٹ گئیں اور وہ گر پڑے تو حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ آگے بڑھے، ولید کو ختم کیا اور حضرت عبیدہ کو، جو جاں بلب تھے، اٹھا کر لے آئے۔ انہوںؓ نے کہا مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں لے چلو۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے حضورؐ سے پوچھا کہ میرے متعلق فرمائیے تو حضورؐ نے فرمایا کہ 'تمہیں یقیناً جنت ملے گی' تو ان کے چہرہ پر بشاشت آئی اور ان کی زبان سے

نکلا "کاش! آج ابوطالب زندہ ہوتے تو وہ دیکھتے کہ میں نے ان کی بات سچ کر دکھائی ہے کہ اپنی جان حضورؐ پر نچھاور کر دی ہے"۔ بات یہ تھی کہ جب مشرکینِ مکّہ کا جناب ابوطالب پر شدید دباؤ پڑتا تھا کہ تم اور بنو ہاشم، محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی حمایت سے دست کش ہو جاؤ تاکہ ہم انؐ سے نمٹ لیں یعنی (نعوذ باللہ) آپؐ کو قتل کر دیں تو عام طور پر جناب ابوطالب اس وقت ایک شعر پڑھا کرتے تھے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ

"تم محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) پر اس وقت تک قابو نہیں پا سکو گے جب تک انؐ کی حفاظت میں ہمارا بچہ بچہ کٹ کر مر نہ چکے گا۔"

حضرت عبیدہؓ کا انتقال میدان بدر میں نہیں ہوا بلکہ فتح کے بعد جب اسلامی لشکر مدینہ منوّرہ واپس جا رہا تھا تو راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ ان کی قبر میدان بدر سے آگے مدینہ منورہ کے راستے میں ہے۔

بہرحال ۱۷/ رمضان المبارک سن دو ہجری میں میدانِ بدر میں باقاعدہ اور دوبدو جنگ کی صورت میں اندرون عرب انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کے چھٹے اور آخری مرحلہ یعنی مسلّح تصادم (Armed Conflict) کا آغاز ہو گیا۔ اس غزوہ میں قریش کے سرکردہ لوگوں میں سے ابوسفیان کے علاوہ اور ابولہب کے علاوہ باقی قریباً تمام ہی کھیت رہے۔ واضح رہے کہ ابوسفیان چونکہ تجارتی قافلے کے ہمراہ تھے، لہٰذا وہ اس جنگ میں شریک نہیں ہو تے تھے۔ اسی طرح ابولہب بھی جنگ میں شریک نہیں تھا اس نے اپنی جگہ کرائے کا فوجی بھیج دیا تھا۔ قریش کے کل ستّر سربرآوردہ لوگ مقتول ہوئے۔ ابوجہل مارا گیا، عتبہ ابن ربیعہ، اس کا بھائی اور بیٹا قتل ہوئے۔ اسی طرح نضر ابن حارث، امیہ ابن خلف، عقبہ ابن ابی محیط جیسے مشرکین جو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے کٹّر دشمنوں میں سے تھے اور خون کے پیاسے تھے، گاجر مولی کی طرح قتل کر دیئے گئے۔

سُنّت اللہ کا ظہور اس کے وجہ بھی سمجھ لیجئے۔ اصل میں یہ عذاب الٰہی تھا۔ اللہ تعالیٰ کی سنّت یہ رہی تھی کہ جب وہ کسی قوم یا ملک کی طرف کسی رسول کو بھیجتا تھا ——

یہاں 'تھی' اور 'تھا' اس لئے کہہ رہا ہوں کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بعد ہر نوع کی نبوّت و رسالت کا دروازہ ہمیشہ ہمیش کے لئے بند ہو چکا ہے۔ لہٰذا ایسے مواقع پر میں کوشش کرتا ہوں کہ لفظِ 'ہے' میری زبان پر آئے ہی نہیں تاکہ کسی درجہ میں بھی نبوّت و رسالت جاری رہنے کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہ ہو —— تو اللہ جس قوم یا ملک کی طرف اپنے رسول کو بھیجتا تھا اور اگر وہ قوم انکار پر اس درجہ اڑ جاتی تھی کہ رسول کی جان لینے کے درپہ ہو جائے یہاں تک کہ رسول کو وہاں سے ہجرت

کرنی پڑے تو رسول اور ان کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد اس قوم پر عذاب کا آنا لازم ہوتا تھا۔ رسول اور ان کے اصحاب کو بچا لیا جاتا تھا اور پوری قوم ہلاک کر دی جاتی تھی۔

البتہ عذاب الٰہی کی صورتیں اور ذیتیں مختلف رہی ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ پوری قوم کو ایک عظیم طوفان باد و باراں کے ذریعہ غرق کر دیا گیا۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ معاملہ ہوا اور کہیں ایسا ہوا ہے کہ پوری کی پوری قوم کو ان کی بستیوں کے اندر ہی ختم کر دیا گیا جیسے قوم لوط، قوم عاد اور قوم ثمود کی بستیاں: تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ ۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ اہل تمرد کو زمین میں دھنسا دیا جاتا ہے جیسے قارون کے ساتھ معاملہ ہوا اور کہیں ایسا ہوتا ہے کہ کفار و مکذبین کے سر برآوردہ اور چیدہ چیدہ لوگوں کو اپنی بستیوں سے باہر نکالا اور ان کو عذاب الٰہی نے ملیامیٹ کر دیا جیسے آل فرعون کو حضرت موسیٰ کے تعاقب میں نکالا اور ان کو سمندر میں غرق کر دیا گیا: سورۂ عنکبوت میں ان چاروں انواع کے عذاب کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنبِهِ فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُم مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ ۚ وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا ۚ

آل فرعون کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس سے ملتا جلتا معاملہ قریش مکہ کے ساتھ کیا گیا۔ یہاں اسی سُنَّۃ اللہ کا ظہور صرف اس فرق کے ساتھ ہمیں ملتا ہے کہ آل فرعون کو تو سمندر میں غرق کر دیا گیا لیکن قریش کے جو نامی گرامی سردار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچاتے رہے تھے، جو حضورؐ کے خون کے پیاسے تھے جو توحید کی انقلابی دعوت کے شدید مخالف تھے، ان سب کو میدان بدر میں کھینچ بلایا۔ اور اہل ایمان کے ہاتھوں انہیں قتل کرا دیا۔ اسی سُنَّۃ اللہ کی جانب اشارہ سورۃ الانفال کی آیت نمبر ۱۷ کے آغاز میں ہے کہ: فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۔ (اے مسلمانو! تم نے ان (مشرکین مکہ) کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے آپ کو ابھی بتایا تھا کہ ابولہب میدان میں نہیں آیا تھا وہ کمینہ ہونے کے ساتھ بزدل بھی تھا۔ چنانچہ لڑنے والے کو بھیج دیا تھا۔ لیکن عذاب الٰہی سے وہ بھی نہ بچ سکا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے کچھ دنوں بعد وہ مکہ کے اندر ہی وہ پلیگ جیسی کسی بیماری میں مبتلا ہو کر نہایت عبرت ناک موت سے دوچار ہوا۔ اس کا تمام جسم سڑ گیا تھا اور اس میں شدید تعفن پیدا ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے اپنے قریبی رشتہ داروں نے بھی اس کو ہاتھ نہیں لگایا

بلکہ اس کی نعش کو لکڑیوں سے دھکیل دھکیل کر ایک گڑھے میں دفن کر دیا۔ اس کا یہ حشر مکہ میں ہوا تھا۔ چونکہ وہ بدر میں آیا ہی نہیں تھا۔

پس دراصل غزوۂ بدر میں صنادید مشرکین کی ہلاکت اس سُنَّۃ اللہ کے اور قانونِ الٰہی کے مطابق دنیوی عذابِ الٰہی تھا جو اللہ نے رسولوں کی تکذیب اور ان کو دیس سے نکلنے پر مجبور کرنے والے کفار و مکذبین کے لئے طے کر رکھا ہے ـــــ صحابہ کرامؓ میں سے تیرہ نے میدانِ بدر میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ ایک حضرت عبیدہؓ ہیں جو زخمی تھے۔ واپسی کے سفر میں اثنائے راہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح گویا صحابہ کرامؓ کی طرف سے چودہ افراد نے جان کا نذرانہ اپنے رب کے حضور پیش کر دیا اور کفار و مشرکین کے ستر صنادید خاک و خون میں مبتلا ہو کر واصل جہنم ہوئے۔ مزید یہ کہ ستر مشرکین کو اہلِ ایمان نے قید کر لیا۔

غزوۂ بدر کے اثرات

غزوۂ بدر کا جو نتیجہ نکلا اور اس کے جو اثرات مترتب ہوئے اب ان کو سمجھ لیجئے۔ سب سے پہلی اور واضح بات یہ کہ پورے عرب میں اہلِ ایمان کی دھاک بیٹھ گئی۔ خاص طور پر بدر کے قریب کے علاقہ پر۔ اور اس طرح اس غزوہ میں فتح و کامرانی کی بدولت دعوت و تحریک توحید کو اور اسلامی انقلابی جد وجہد کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ پورے عرب میں جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ قریش کا کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار کا لشکر جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تین سو تیرہ قریباً نہتے اور بے سر و سامان صحابہؓ کرام سے شکست کھا گیا ـــ قریباً نہتے اور بے سر و سامان میں اس لئے کہتا ہوں کہ یہ حضراتِ قدسی جنگ کے ارادے سے تو نکلے ہی نہیں تھے، وہ تو اوّلاً صرف ابوسفیان کے قافلہ کا راستہ روکنے کے لئے نکلے تھے۔ مدینہ سے روانگی کے وقت تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک ہزار کے لشکر سے مڈھ بھیڑ ہو جائے گی ـــــ میں آج صبح سیرتِ محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر وہ کتاب پڑھ رہا تھا جو جناب محمد ابن عبدالوہاب نجدی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ نے لکھی ہے۔ اس میں بڑی تفصیل سے یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت صرف اس قافلہ پر یورش کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا جو مالِ تجارت لے کر شام سے واپس آ رہا تھا۔ لہٰذا کوئی نفیرِ عام نہیں تھی۔ کوئی اعلانِ جنگ نہیں تھا۔ قافلہ کے ساتھ محافظوں کی تعداد کا اندازہ کر کے حضورؐ مدینہ سے روانہ ہوئے تھے یہ تو مدینہ سے باہر نکل کر حضورؐ کو خبر ملی ہے کہ مسلمانوں کی قافلہ پر یورش کے ارادہ کی خبر قریش کو مل چکی ہے اور قریش کا کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار کا لشکر مدینہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

مشاورت کی فضا یہ خبر ملنے کے بعد حضورؐ نے مشورہ فرمایا ہے کہ کیا ارادہ ہے؟ قافلہ کی طرف چلیں یا لشکر کی طرف! ۔ اس مشاورت کا حال میں تفصیل سے آپ کو گذشتہ کئی تقاریر میں سنا چکا ہوں ۔ اس وقت مجھے اس ضمن میں جو اضافہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس موقع پر جن بعض صحابہ کرامؓ نے قافلہ کی طرف چلنے کا مشورہ دیا تھا تو اصل میں اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم جنگ کے لئے تو تیار ہو کر نکلے ہی نہیں ۔ نہ ہم نے اس اعتبار سے اپنی نفری بنائی ہے اور نہ ہی اس کے لئے ساز و سامان ساتھ لیا ہے ۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ غزوہ ذوالعشیرہ میں ڈیڑھ سو مہاجرینؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ۔ جبکہ غزوۂ بدر کے موقع پر صرف ترسٹھ[۶۳] یا تیاسی[۸۳] مہاجرین حضورؐ کے ہمراہ تھے ۔ گویا مہاجرین کی نفری بھی پوری نہیں تھی ۔ لہٰذا یہ رائے نہ تو بزدلی کی بنیاد پر تھی اور نہ منافقت کی بنیاد پر بلکہ جو بھی احوال و اسباب تھے، ان کی بنیاد پر یہ صحیح تھی کہ ہم اس ارادہ سے نہیں نکلے ۔ لہٰذا قافلہ کی طرف چلنا بہتر اور مناسب ہوگا لیکن حضورؐ کا منشا کچھ اور تھا ۔ حضورؐ اللہ کی مشیت کے مطابق چاہتے تھے کہ فیصلہ ہو جائے : لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۔ کہ "جو مرے وہ دلیل کے ساتھ مرے اور جو جیئے وہ دلیل کے ساتھ جیئے ۔"

بہرحال میں اس مشاورت کی روداد پہلے ہی بیان کر چکا ہوں ۔ اب عالم عرب میں جب یہ خبر پہنچی کہ قریش کی ایک ہزار کی جمعیت تین سو تیرہ مسلمانوں سے شکست کھا گئی ۔ ان کے بڑے بڑے ستون غزوۂ بدر میں کھیت رہے : فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ یعنی مشرکین مکہ میدان بدر میں ایسے پڑے ہوئے تھے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے ۔ ابوجہل میں ابھی جان تھی جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پاس آ کر اس کی گردن پر اپنا پاؤں مبارک رکھا اور فرمایا : هٰذَا فِرْعَوْنُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ ۔ "اس امت کا فرعون یہ شخص ہے" ۔ پس اس فتح سے اہل ایمان کو بڑی تقویت حاصل ہوئی ۔ ایک طرف ان کا حوصلہ (MORALE) بہت بلند ہوا ۔ دوسری طرف تمام عرب پر مسلمانوں کی ہیبت اور رعب پڑ گیا ۔ لہٰذا غزوہ بدر کے بعد تیرہ ماہ مسلمانوں کے شادمانی اور مسرت کے گزرے ، اسلام کی دعوت کے اثرات میں وسعت پیدا ہوئی لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اب کچھ کچے اور ضعف ارادہ کے حامل لوگ بھی آ کر شامل ہو گئے ۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے ۔ اس سے پہلے تک تو معاملہ یہ تھا کہ جو آتا تھا وہ پوری طرح سوچ سمجھ کر آتا تھا ۔ وہ جانتا تھا کہ دعوت اسلام قبول کرنے سے اس پر کیا ذمہ داریاں عاید ہو جائیں گی اور کن کن خطرات سے اسے دوچار ہونا پڑے گا ۔ جان ہر لمحہ ہتھیلی پر رکھنی ہوگی ۔ اس راہ میں مشکلات کے پہاڑ آئیں گے ۔ مصائب

وشدائد سے سابقہ پیش آئے گا۔ لیکن بدر کی فتح سے جب صورتِ حال بدل گئی تو کچھ لوگوں نے بھی پیشقدمی کی، وہ بھی آگئے۔

غزوۂ اُحد

غزوۂ بدر رمضان المبارک ۲ھ میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ تیرہ ماہ بعد شوال ۳ھ میں مشرکینِ مکہ کا ایک لشکرِ جرّار مدینہ پر چڑھ کر آگیا جو جوشِ انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ اس وقت ان کے سینوں میں انتقام کی جو آگ کھول رہی تھی اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ تو قبائلی زندگی کا جن کو کچھ تجربہ ہے اور جن کو عرب کے انتقامی جذبات و احساسات سے کچھ واقفیت ہو اور جنھوں نے ان کی اس دور کی شاعری اور خطبات پڑھے ہوں وہ کچھ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس طور پر اس وقت ان کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ مکہ والوں نے غزوۂ بدر کے بعد ایک دن بھی چین و آرام میں نہیں گزارا۔ انتقامی جذبات لاوے کی طرح ہر دل میں کھول رہے تھے۔ ابوسفیان نے قسم کھائی تھی کہ جب تک مقتولینِ بدر کا انتقام نہیں لے لیا جائے گا نہ خوشبو لگاؤں گا نہ چارپائی پر سوؤں گا۔ اسی طرح اس ایک سال کے دوران ہندہ کا جو حال رہا ہے، آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ باپ مارا گیا، چچا مارا گیا، بھائی مقتول ہوا۔ یہ ہندہ ابوسفیان کی بیوی اور عتبہ کی بیٹی ہیں، حضرت ابوحذیفہؓ کی بہن ہیں جو سابقون الاوّلون میں سے ہیں۔ ہندہ بھی فتح مکہ کے موقع پر ایمان لے آئی تھیں اور مومنہ صادقہ ثابت ہوئیں۔

قریش کی پیش قدمی اور حضورؐ کی مشاورت —!

بہرحال اب جو لشکر چڑھ کر آیا وہ تین ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ قریش اپنی اور اپنے حلیفوں کی جو ممکنہ قوت اور طاقت لا سکتے تھے وہ لے کر میدان میں آگئے۔ اس موقع پر بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منوّرہ میں ایک مشاورت منعقد فرمائی۔ میں یہ واقعات اس لئے آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جماعتی زندگی اور انقلابی جدّوجہد سے متعلق بعض اہم پہلو اس سے نمایاں ہوں گے۔ دعوت، تنظیم اور تربیت کے جن مراحل کا ہم جائزہ لے چکے ہیں۔ اب ان کے عملی مظاہرے اور انطباق کے مواقع آرہے ہیں۔ وہی تیاری تھی جو اب یہاں استعمال ہو رہی ہے تو تنظیمی اعتبار سے یہ بات بڑی اہم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اہم فیصلہ بھی یک طرفہ نہیں فرمایا بلکہ مشورے کے طور پر صحابہ کرامؓ کے سامنے معاملہ پیش فرمایا۔ مجلسِ مشاورت پھر منعقد ہو رہی ہے جیسے غزوۂ بدر سے پہلے ہوئی تھی۔ حضورؐ مشورہ طلب فرما رہے ہیں کہ بتاؤ کیا حکمتِ عملی اختیار کریں، تین ہزار کا لشکر مدینہ

پر چڑھائی کرنے آ رہا ہے۔

حضورؐ کی ذاتی رائے تھی کہ مدینہ میں محصور ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عجیب اتفاق ہے کہ رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی کی رائے بھی یہی تھی۔ آخر جھوٹا انسان ہر موقع پر تو جھوٹ نہیں بولتا۔ کبھی وہ سچ بھی بولتا ہے۔ عبداللہ ابن ابیؓ مدینہ کا رہنے والا تھا لہٰذا وہ اپنے حالات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس طرح کی صورتِ حال میں مدینہ والے محصور ہو کر مدافعت کیا کرتے تھے تاکہ مرد گلیوں میں دو بدو لڑیں اور عورتیں اوپر سے دشمن پر پتھراؤ کریں۔ اس طرح گویا کہ ان کی دوہری طاقت روبکار آ جاتی تھی۔ چنانچہ انہی مصلحتوں کے پیشِ نظر عبداللہ ابن ابی کی رائے بھی یہ تھی کہ ہمیں کھلے میدان میں جنگ کرنے کے بجائے محصور ہو کر اپنی مدافعت کرنی چاہیئے۔ بعض قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رجحان بھی یہی تھا۔

لیکن ایک تو اکابر صحابہ میں سے بعض حضرات کھلے میدان میں جنگ کرنے کے حامی تھے۔ ان میں حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی نام شامل ہے ـــــ اب یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے تھا کہ اسی جبلِ اُحد کے دامن میں ان کی شہادت ہونی ہے۔ لہٰذا ان کا خصوصی جوش تھا کہ نہیں ہمیں مردانہ وار دو بدو جنگ کرنی ہے ہمیں تو شہادت درکار ہے ـــــ دوسرے یہ کہ نوجوانوں کی طرف سے بھی یہی مطالبہ تھا، خاص طور پر ان کی طرف سے جو غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ چونکہ غزوہ بدر کے موقع پر نفیرِ عام تو تھی ہی نہیں۔ جنگ کے ارادے سے تو اس وقت نبی اکرمؐ اور چند صحابہؓ نکلے ہی نہیں تھے۔ تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ جو لوگ اس غزوہ میں شریک ہونے سے رہ گئے تھے ان کے سینوں میں کتنی حسرت ہو گی کہ کتنی بڑی سعادت سے ہم محروم رہ گئے۔ لہٰذا ان کا بھی جوش و خروش تھا کہ ہمیں کھلے میدان میں جا کر جنگ کرنی چاہیئے۔ پھر اس تیرہ ماہ کے عرصہ میں جو لوگ ایمان لائے تھے، ان کے ذہنوں میں ہو سکتا ہے کہ یہ بات ہو کہ جب تین سو تیرہ نے بدر میں اتنی بڑی فتح حاصل کی ہے تو اللہ کی مدد آخر یہاں بھی تو ہمارے شاملِ حال ہو گی لہٰذا فتح تو ہمیں ہونی ہی ہونی ہے تو ہم اپنے دامن پر یہ داغ کیوں گوارا کریں کہ ہم نے مردوں کی طرح کھلے میدان میں جا کر جنگ نہیں کی۔ پس یہ مختلف اسباب تھے جن کی وجہ سے محسوس ہوا کہ زیادہ لوگوں کی خواہش ہے کہ کھلے میدان میں جنگ ہو۔

پس نبی اکرمؐ نے اپنی رائے کو پیچھے رکھا اور اپنے ساتھیوں کی رائے کے مطابق فیصلہ فرما دیا کہ کھلے میدان ہی میں مقابلہ کیا جائے گا۔ اس طرح جماعتی زندگی کا ایک اہم اصول سامنے آ گیا۔ مشورہ

اور اس کی اہمیت سامنے آگئی۔ اگرچہ اسلامی نظم جماعت میں فیصلہ کا آخری اختیار امیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ اکثریت کی رائے کا پابند نہیں ہوتا۔ لیکن تدبیر کے معاملہ میں اپنے ساتھیوں کی دلجوئی کے لئے اور ان کے اندر ایک باہمی اعتماد کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے امیر کے لئے ضروری ہے کہ وہ کبھی اپنے ساتھیوں کا احترام کرتے ہوئے ان کی رائے کے مطابق فیصلہ دے جیسا حضورؐ کے اسوہ حسنہ سے سامنے آتا ہے۔ البتہ یہ طرز عمل صرف تدبیر کے معاملہ میں اختیار کیا جائے گا۔ ظاہر بات ہے کہ نص میں، یعنی ایسے معاملے میں جہاں اللہ اور اس کے رسول کا صریح حکم موجود ہو یہ طرز عمل ہرگز اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ تدبیر کے معاملہ میں بھی یہ بات ذہن نشین رہے گی کہ گو تدبیر ہماری ہے لیکن مآل کار تمام معاملات کا اختیار تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جو وہ چاہے گا نتیجہ اس کے مطابق ظاہر ہوگا

تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحابؓ کی اکثریت کی رائے کا احترام کرتے ہوئے فیصلہ فرما دیا کہ کھلے میدان میں جنگ ہوگی۔ اس کے بعد غیر معمولی واقعہ یہ ہوا کہ نبی اکرمؐ اپنے حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے۔ جب برآمد ہوئے تو آپؐ نے زرہ زیب تن فرمائی ہوئی تھی۔ یہ غیر معمولی بات تھی۔ صحابہ کرامؓ کا ماتھا ٹھنکا ——— حضورؐ نے خواب بھی دیکھا تھا کہ ایک گائے ذبح ہوئی ہے اور بھی چند باتیں خواب میں ایسی دیکھی تھیں جس سے حضورؐ کو اندازہ تھا کہ میدان احد میں چند غیر معمولی اور ناخوشگوار واقعات ظہور پذیر ہوں گے ——— حضورؐ کو زرہ پہنے دیکھ کر لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ ہم اپنی رائے واپس لیتے ہیں۔ آپؐ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ اور انتظام فرمائیں ——— اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ نہیں فیصلہ برقرار رہے گا۔ نبی کو یہ زیبا نہیں ہے کہ ہتھیار باندھنے کے بعد بغیر جنگ کئے انہیں اتار دے۔

قریباً یہی بات سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۵۹ میں فرمائی گئی ہے جو گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کی توثیق میں نازل ہوئی ہے ——— یہ بات متفق علیہ ہے کہ سورہ آل عمران کا بیشتر حصہ غزوہ احد کے بعد نازل ہوا ہے ——— محولہ بالا آیت میں بالکل وہی نقشہ ہے جس پر حضورؐ نے عمل فرمایا تھا۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ جو کام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی اجتہاد سے کئے، بعد میں اللہ کی طرف سے قرآن مجید میں ان کی توثیق آگئی ——— بہر حال وہ آیت مبارکہ یہ ہے کہ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ "اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ اللہ تعالیٰ کا آپؐ پر بڑا فضل و کرم ہے اور اس کی آپؐ پر

نبی رحمت ہے کہ آپؐ اپنے ان ساتھیوں کے حق میں بڑے نرم ہیں۔ ان کی دلجوئی فرماتے ہیں "اگر آپؐ کہیں سخت دل اور درشت خو ہوتے تو یہ لوگ منتشر ہو گئے ہوتے (آپ کے پاس سے چھٹ گئے ہوتے)"
اقبالؔ نے اس مضمون کو بڑی خوبصورتی سے ایک شعر میں سمو دیا ہے کہ

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے　　　کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

تو یہ خوئے دلنوازی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بکمال و تمام تھی۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس اسلوب سے فرمائی: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۚ آگے ارشاد ہوتا ہے: فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ "پس ان کی خطاؤں سے درگذر کیجئے اور ان کے لئے استغفار بھی کرتے رہا کیجئے"۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ "اور ان سے معاملات میں مشورہ بھی لیجئے"

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ "جب آپ فیصلہ کرلیں تو پھر آپؐ اللہ پر توکل کیجئے" یعنی پھر فیصلوں کا بار بار بدلنا درست نہیں۔ آیت کا اختتام ہوتا ہے ان عظیم ترین الفاظ مبارکہ پر:
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ "بلاشبہ اللہ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں سے" جن کو اللہ محبوب قرار دے ان سے خوش بخت وخوش نصیب اور کون ہو سکتا ہے!

اُحُد کی جانب کوچ اور منافقین کا طرزِ عمل!

بہرحال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہزار کی نفری لے کر مدینہ سے جبلِ اُحُد کی جانب کوچ فرمایا لیکن راستے ہی میں عبد اللہ ابن ابی تین سو افراد کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے کر چلا گیا کہ جب ہمارے مشورے پر عمل نہیں ہوتا اور ہماری بات نہیں مانی جاتی تو ہم ساتھ کیوں دیں اور اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈالیں! اب آپ اندازہ کیجئے کہ مدنی دور کے قریباً ڈھائی سال کے اندر اندر جنگ کے قابل مسلمانوں کی کل نفری کا لگ بھگ ایک تہائی منافقین پر مشتمل ہو چکا تھا۔ معاملہ کی نزاکت کا آپ کو کوئی اندازہ ہوا؟ —— اس لئے کہ جو تین سو واپس چلے گئے ان کے منافق ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا۔ کمزور اور ضعفِ ایمان والے اور بھی تھے۔ یہ جو سات سو افراد رہ گئے تھے، ان میں بھی تھے [1] چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ دامنِ احد میں پہنچ کر مدینہ کے دو خاندانوں کے افراد نے کم ہمتی کے باعث واپس لوٹنا چاہا۔ سورہ آلِ عمران میں اس کا ذکر بھی موجود ہے: اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَ

---

[1] آپ کو یاد ہوگا کہ میدان بدر سے بھی قریش کے دو گھرانے یہ خبر سن کر کہ قافلہ بحفاظت مکہ پہنچ گیا ہے واپس مکہ چلے گئے تھے۔

اللّٰہُ وَلِیُّھُمَا ط۔ یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ ایسے تھے جو ڈھیلے پڑ گئے تھے (کمزوری دکھانے والے تھے) لیکن اللہ ان کا مددگار تھا' ان کا پشت پناہ تھا۔ اس نے ان کو سنبھال لیا اور وہ میدان میں ڈٹے رہے — چنانچہ یہ دونوں گروہ بعد میں کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو 'مِنْکُمْ' قرار دیا ہے۔ یعنی امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام ہی میں شامل قرار دیا ہے اور اپنی ذات سبحانہٗ کو ہمارا ولی' دوست' پشت پناہ فرمایا ہے — البتہ اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ ان دو گروہوں میں کمزوری پیدا ہوئی تھی' ان کی ہمت جواب دینے لگی تھی لیکن تھے وہ اصحابِ ایمان! جب ہی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سنبھال لیا۔ لیکن جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر راستہ ہی سے عبد اللہ ابن ابیّ کے ساتھ واپس مدینہ چلے گئے ؛ ظاہر ہے ان کے نفاق میں کوئی شک نہیں ہو سکتا گویا ایک ہزار میں سے تین سو کی نفری کے متعلق یہاں ثابت ہو رہا ہے کہ وہ منافقین پر مشتمل تھی۔

فوری فتح

بہر حال جنگ شروع ہوئی اور پہلے ہی ہلے میں اللہ کی مدد و نصرت آئی اور بالکل بدر کا سا نقشہ سامنے آ گیا۔ کہاں وہ تین ہزار کا لشکر اور کہاں یہ سات سو! قریش کے ساتھ دو سو گھوڑوں کا رسالا تھا۔ عرب کے اس دور کے حالات کے اعتبار سے یہ بہت بڑی بات تھی۔ میدانِ بدر میں ان کے پاس سو گھوڑے تھے اور اہل ایمان کے پاس صرف دو گھوڑے تھے۔ ایک حضرت مقداد ابن الاسود اور ایک حضرت زبیر ابن العوام کے پاس۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ قریش کے ساتھ سات سو اونٹ تھے جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ ستّر تھے۔ اسی کے متعلق حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام کی ایک نظم 'بدر کی فریاد' میں بڑے پیارے انداز میں یہ نقشہ کھینچا ہے :

یہ ستّر اونٹ دو گھوڑے یہاں سیراب ہو جاتے
مجاہد بھی وضو کرتے' نہاتے غسل فرماتے

(جاری ہے)

اسلام کی انقلابی قدروں کا علمبردار

میثاق

خود پڑھیے اور دوسروں کو پڑھائیے

فی شمارہ تین روپے — سالانہ زرِ تعاون تیس روپے
قریبی بک اسٹال سے حاصل کریں یا ہم سے طلب فرمائیں

مکتبہ تنظیم اسلامی — ۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون نمبر۔ ۸۵۲۶۱۱

نزلہ، کھانسی اور زکام
سردی کے موسم میں عام

مناسب احتیاط برتیے ۔ بروقت سُعالین لیجیے

سردیوں میں اگر آپ کو نزلہ، زکام، کھانسی یا گلے میں خراش کی شکایت ہو جائے تو فوراً سُعالین کا باقاعدہ استعمال شروع کر دیجیے۔ اور اگر خدا نخواستہ تکلیف بڑھ جائے تو ایک پیالی تیز گرم پانی میں سُعالین کی چار ٹکیاں حل کر کے جوشاندے کے طور پر صبح و شام پیجیے۔
سُعالین آپ کو ان بیماریوں سے محفوظ بھی رکھتی ہے اور نجات بھی دلاتی ہے۔

اخلاق عالمی مذہب ہے اور مذہبِ اسلام اخلاق ہے۔

ADARTS-SUA-3/85

تاریخی گوشے

حکیم محمود احمد برکاتی

انتخابِ امامُ الہندؒ

جمعیۃ علماء ہند، شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نسبت و حوالہ سے ایک اہم مسئلہ "نظمِ جماعت اور انتخابِ امام الہند" کا ہے، جس کی بہت سی تفصیلات قارئین، محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی متعدد تحریروں کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے مضامین میں بھی پڑھ چکے ہیں۔

خاص طور پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے تفصیلی مضامین میں اس مسئلہ پر بڑی شرح و بسط سے لکھا ہے اور یہ ثابت کیا کہ مختلف مراحل سے گذر کر یہ مسئلہ اس موڑ پر پہنچ چکا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی امامت پر شیخ الہندؒ سمیت اکثر و بیشتر حضرات متفق ہو چکے تھے بلکہ شیخ الہندؒ تو نہایت درجہ حساس تھے اور چاہتے تھے کہ جلد از جلد یہ مسئلہ طے ہو اور وہ سب سے پہلے خود بیعت کرنے پر آمادہ تھے۔

جمعیت کا ۱۹۲۰ء کا اجلاس جو حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی کا پہلا اور آخری اجلاس تھا (اس لئے کہ ۱۹۱۹ء کے اجلاس میں شیخ الہند جیل میں تھے اور ۱۹۲۰ء کے بعد جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا) وہ اس لحاظ سے فیصلہ کن تھا اور عام طور پر امید ہو چلی تھی کہ یہ بات طے ہو جائے گی لیکن ہندوستان کی ایک علمی تحریک "خیر آباد" کے گل سرسبد علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری قدس سرہ کی مخالفت نے سارے منصوبے کو الیسا التوا میں ڈالا کہ پھر اس سلسلہ میں کوئی مزید پیش رفت نہ ہو سکی۔ اس کے بعد جلد ہی حضرت شیخ الہندؒ انتقال کر گئے۔ ایک مضبوط اور ذمہ دار شخصیت کے اٹھ جانے کا اثر سبھی پر ہوا۔ خود مولانا آزاد کے جذبات بھی سرد پڑ گئے۔ اور ۱۹۲۱ء میں جب لاہور میں اجلاس ہوا تو بقول ملک نعر اللہ خان عزیز اور ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی توقع ہی نہیں یقین تھا کہ اب ضرور کچھ ہو گا، لیکن ایسا نہ ہوا۔ جس کا راز بعد میں یہی کھلا کہ مولانا اجمیری

بنیادی طور پر اس معاملہ کے التواء کا باعث بنے تھے، البتہ بعد ازاں بعض دوسرے علماء بھی جن میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا نام نمایاں ہے، تجویز کے مخالف ہو گئے تھے اس ضمن میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے مولانا عبدالماجد بدایونی سے سنے ہوئے چند جملے نقل کئے تھے جو مبینہ طور پر اس سلسلہ میں مولانا اجمیری نے مولانا آزاد سے مخاطب ہو کر کہے تھے جن میں یہ تیکھے الفاظ بھی شامل تھے کہ :

" ایاز قدرِ خود بشناس "

سلسلہ خیر آباد سے کے ایک فاضل حکیم محمود احمد برکاتی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور ایک لمبی تحریر کے ذریعہ یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ مولانا اجمیری نے یہ جملہ نہیں کہا تھا اور بعد میں ان کے مولانا آزاد سے تعلقات و مراسم بہت اچھے رہے۔

ہمیں تعلقات و مراسم کی اچھائی کا انکار بالکل نہیں لیکن یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ برکاتی صاحب یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کے سلسلہ میں علماء بے حد حساس تھے ایسا کرنا چاہتے تھے لیکن ۱۹۲۰ء کے اجلاس میں ایسا نہ ہو سکا تو آخر کیوں ؟ اور پھر ۱۹۲۱ء کے اجلاس میں لوگوں کی توقع کے باوجود اس کا کسی نے ذکر تک نہ کیا تو اس کا سبب کیا ہے ؟

ہم ان کی بات تسلیم کر لیتے ہیں کہ مولانا آزاد اور علامہ اجمیری کے تعلقات بڑے خوشگوار رہے اور ایسا ہونا باعثِ تعجب اس لئے نہیں کہ شرفاء تعلقات کے معاملہ میں بڑے وضعدار ہوتے ہیں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مولانا اجمیری نے یہ جملہ نہیں کہا اور وہ اس کے معرضِ التواء میں ڈالنے کا سبب نہیں بنے ـــــ یہ جملہ نہ سہی تو اس کے قریب قریب کوئی جملہ کہا ہوگا ـــــ آخر اتنی اہم تجویز جس پر شیخ الہند جیسا انسان مصر ہے، اسے روکنے کی غرض سے کسی بھاری پتھر کی ضرورت تو رہتی ہی ہے اور وہ بھاری پتھر مولانا اجمیری کا یہ نہ سہی تو اس کے قریب قریب کوئی چبھتا ہوا جملہ ہوگا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضامین میں جو تفصیلات دی ہیں ان کی سچائی اپنی جگہ باقی رہتی ہے اور ان کا انکار ممکن نہیں۔

بہر طور تاریخ کے اس پیچیدہ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر محترم برکاتی صاحب کا مضمون

پیشِ خدمت ہے۔ شاید کوئی "رجلِ رشید" ان کڑیوں کے سلسلہ میں مزید خانہ پری کرسکے۔

ہمارے لئے سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ملّت کی اصلاح و بقاء کی غرض سے ایک اہم منصوبہ ایسے معرضِ التوا کا شکار ہوا کہ پھر اس کی صدائے بازگشت مدّتوں نہ سنی گئی۔

"تنظیمِ اسلامی" کے نام سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے حال ہی میں جس کوشش کا آغاز کیا ہے، وہ درحقیقت اسی منصوبہ کی صدائے بازگشت ہے ——— انہوں نے انہی اصولوں اور مقاصد کو سامنے رکھ کر ایک قافلہ کی ترتیب کی کوشش کی ہے اور اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ لوگ اس طرف متوجّہ ہو رہے ہیں، انہوں نے اس رخ پر سوچنا شروع کر دیا ہے اور اس کی اہمیت کا احساس بڑھنا شروع ہوگیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ربّ العزّت ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقاء و شرکاء کو دولتِ خلوص و اخلاص سے نوازیں اور ان کی مساعی بارآور ہوں۔ یہ درخت ہرا بھرا ہو اور اس کے سایہ و ثمر سے امّتِ مسلمہ بھرپور فائدہ اٹھائے۔ ع ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد !!

(ادارہ)

۱۹۲۰ء/۱۳۳۹ میں مولانا معین الدین نے جمعیۃ العلماء ہند کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی اور اس اجلاس کی ایک نہایت اہم تجویز کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سلیمان ندوی اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری کئی سال سے برعظیم کے مسلمانوں کو ایک اہم دینی و ملی فریضے کی طرف اپنے خطبات و مقالات کے ذریعے دعوت دے رہے تھے۔ یہ حضرات مسلمانوں کو دعوت دے رہے تھے کہ نظمِ جماعت قائم کر کے نصب امامت کریں، مسلم حکومت کے زوال اور غیر مسلم حکومت کے استیلائی حالت میں مسلمانوں کے لئے شرعاً صرف دو ہی صورتیں جائز و باقی رہ جاتی ہیں یا وہ اس ملک سے ہجرت کر جائیں یا پھر نظمِ جماعت قائم کر کے اپنے لئے ایک امیر یا امام کا انتخاب اور نصب کرلیں، ورنہ ان کی زندگی غیر شرعی و جاہلی زندگی ہوگی۔

علماء ہند کی ایک تعداد مرتبۂ اجمال ہی اس تجویز پر تو متفق ہوگئی تھی مگر اس سوال پر گومگو اور کشمکش کا شکار تھی کہ منصب امامت کے لئے مختلف اعتبارات سے موزوں تر اور اہل تر فرد کون ہو سکتا ہے؟ ایک حلقہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی (۱۹۲۶ء) اور ایک حلقہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی طرف رجحان رکھتا تھا اور ایک حلقہ مولانا ابوالکلام آزاد پر دل نہاد تھا، مولانا آزاد کے بعض رفقا نے ان کے انتخاب کے لئے خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعے راہ بھی ہموار کی تھی اور بالخصوص شیخ الہندؒ کو اپنا پرجوش ہم نوا بنا لیا تھا اور وہ کسی امام الہند سے بیعت کے لئے اپنی بے تابی کا اظہار کر چکے تھے اور مولانا آزاد سے بیعت سے متفق بلکہ مرید تھے۔ چنانچہ ۱۹/۲۰/۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو جمعیت کے دوسرے سالانہ اجلاس میں شیخ الہند کے حلقے کے علماء نے مولانا آزاد کو امام الہند منتخب کر لئے جانے کا منصوبہ بنا لیا تھا، اجلاس میں بقول بعض مفتی کفایت اللہ نے اور بقول بعض مولانا ابوالمحاسن نے تجویز پیش کی، شیخ الہند کی حمایت و تائید پہلے ہی معروف تھی آخر میں مولانا آزاد کھڑے ہوئے اور انہوں نے امارت شرعیہ کے قیام اور اس کے وجوب اور مصالح و منافع پر ایک نہایت مدلل و مفصل اور مرصع و موثر تقریر کی جس سے صرف شیخ الہند ہی کا حلقہ نہیں بلکہ حاضرین اجلاس کی اکثریت ایسی مسحور ہوئی کہ مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کے لئے آمادہ و مستعد ہو گئے، یہ لمحہ تھا جب مولانا معین الدین نے خطاب کی اجازت مانگی جو بمشکل ملی اور انہوں نے معشر علماء کو اپنے مختصر لیکن موثر خطاب میں اس طرف متوجہ کیا کہ۔

> قیام جماعت اور نصب امارت و امامت کے وجوب سے کسی کو انکار نہیں مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہم امام الہند کا انتخاب آج ہی کر گزریں اور مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت امامت کر لی جائے، یہ مسئلہ جتنا اہم ہے اتنے تدبر اور صبر و سکون سے فیصلے کا متقاضی ہے، عجلت اور جذباتی فضا میں فیصلہ کر ڈالنا مناسب نہیں ہے، ہم سب کو غور و فکر اور تبادلہ خیال کا موقع ملنا چاہیئے۔ تاکہ کوئی صحیح فیصلہ کیا جا سکے اس لئے میری رائے یہ ہے کہ چند دن کے لئے یہ فیصلہ ملتوی کر دیا جائے" (او کما قال)

اس تقریر نے اجلاس کا رنگ بدل دیا، ایک طرف وہ جذباتی فضا چھٹ

گئی جو متعدد علماء خصوصاً مولانا ابوالمحاسن اور مولانا آزاد کی پرجوش خطابت سے طاری ہوئی تھی دوسری طرف مولانا معین الدین کے بے باکانہ انداز بیان نے دوسرے شرکاء کو جرأت عطا کی چنانچہ ان کے بعد مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے التوا کی حمایت میں تقاریر کیں اور اب اجتماع کا رنگ یہ تھا کہ گویا یہی بہت سوں کے دل کی آواز ہے اور التوا ضروری ہے۔

چنانچہ بیعت کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔

۱۸/۱۷ ستمبر ۱۹۲۱ء جمعیت کی مجلس منتظمہ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا اس اجلاس کے ایجنڈے میں ضبط فتوے کے علاوہ مسئلہ انتخاب امام ہند تھا، ان علماء دہلی نے جو مولانا آزاد کو امام الہند ماننے کے لئے تیار نہیں تھے مولانا معین الدین کو اس اجلاس میں شرکت کا پابند کیا، یہ اجلاس ہوا لیکن اس میں بھی کوئی نہ ہو سکا۔

پھر نومبر ۱۹۲۱ء میں تیسرا سالانہ اجلاس ہوا، صدارت مولانا آزاد نے فرمائی لیکن اس اجلاس میں بھی صرف یہ ہوا کہ امیر شریعت (امام ہند) کے اختیارات و فرائض کے تعین کے لئے پندرہ علماء پر ایک کمیٹی بنا دی گئی تاکہ وہ بدایوں میں ہونے والے اجلاس میں ان اختیارات، فرائض امیر شریعت کا مسودہ پیش کرے۔

توضیحات

ہم نے غیر متعلق جزئیات کو نظر انداز کر کے اور مثبت انداز میں مولانا معین الدین کا کردار بیان کیا ہے، یہ معلومات بیش تر زبانی، روایات پر مبنی ہیں رُواۃ ہیں مولانا کے برادر زادے مولانا حکیم نصیر الدین ندوی (نظامی دواخانہ کراچی) مولانا حکیم پیر ہاشم جاں سرہندی مرحوم، مولانا سید حاتم علی رام پوری، مولانا سید منتخب الحق، مولانا عبدالشاہد شروانی مرحوم مولانا سید نجم الحسن خیر آبادی، حکیم مولوی پیر سلیم جان سرہندی (مالتی) ان حضرات کے علاوہ مولانا معین الدین کا ایک مکتوب (بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی) بھی پیش نظر ہے، مگر ماہ نامہ میثاق لاہور کا ایک شمارہ جنوری ۱۹۸۴ء کا پیش نظر ہے جس کے مطالعے کے بعد چند توضیحات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، میثاق کے مقالے سے جو سوالات سامنے آتے ہیں ان کے

جوابات عرض ہیں۔

پہلی بات یہ کہ مولانا کی یہ تقریر کس اجلاس میں ہوئی تھی؟ یوسف سلیم چشتی مرحوم کا یہ بیان تو بالکل ہی بے اصل ہے کہ ۱۹۲۲ء کے اجلاس میں ہوئی تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرورِ زمانہ اور بعض اور اسباب سے کئی حضرات کو اجلاس کا سال صحیح یاد نہیں رہا، مولانا غلام رسول مہر، ملک نصر اللہ خاں عزیز کے بیانات میثاق میں نقل ہو چکے ہیں کہ وہ اجلاس جس میں بیعت ہونا تھی مگر مولانا معین الدین وغیرہ کی وجہ سے نہیں ہو سکی ۱۹۲۱ء مولانا مودودی نے بھی میرے نام ایک مکتوب میں لکھا تھا۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے یہ اجتماع لاہور میں ہوا تھا نہ کہ دہلی میں .... جمعیۃ علماء ہند کے اس اجلاس میں، میں شریک تھا، مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ امام الہند کے انتخاب میں بعض اکابر علماء مانع ہوئے تھے اور یہ انتخاب نہ ہو سکا تھا۔"

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ جمعیت کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی نومبر ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا، ہمارے سامنے خود مولانا معین الدین کا ایک مکتوب (ملک مولانا حکیم نصیر الدین ندوی) ہے جو ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء کو لکھا گیا ہے۔ اور اس میں اس واقعہ کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ جب یہ تقریر ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء سے پہلے ہو چکی تھی تو مجلس منتظمہ کا اجلاس اور سالانہ اجلاس لاہور کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو بالترتیب ۱۷/۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء اور نومبر ۱۹۲۱ء کو ہوئے، مولانا لکھتے ہیں۔

"خالی الذہن علماء ان (مولانا آزاد) کی تقریر سے متاثر ہوئے اور اگر من جانب فقیر اس (انتخاب امامت) کے التواء کے متعلق مختصر و جامع تقریر نہ ہوتی تو کچھ عجب نہ تھا کہ حاضرین علماء اسی وقت اس مسئلے کو طے کر دیتے"

قصہ یہ ہے کہ قیام نظم جماعت اور نصب امام کی دعوت تو کئی سال سے دی جا

ﻋﻠﮧ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے محرک اوّل مولانا آزاد تھے مگر ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ محرک اوّل مولانا ابو المحاسن محمد سجاد بہاری تھے، مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

مولانا ابو المحاسن محمد سجاد پہلے شخص تھے جنہوں نے اس بھولے ہوئے سبق کو

رہی تھی مگر شیخ الہند کی رہائی اور مراجعت ہند (جون ۱۹۲۰ء) کے بعد اس تحریک میں جان پڑ گئی تھی اور شیخ الہند، مولانا آزاد اور ان کے الہلال سے متاثر اور قدر شناس تھے اور اب ان کی نظر میں مولانا آزاد ہی اس منصب کے اہل تھے، شیخ الہند ہی کے اثر سے مفتی کفایت اور مولانا احمد سعید دہلوی نے تجویز و تائید میں حصہ لیا تھا مگر باقی تمام شرکاء اجلاس یا خالی الذہن اور لاعلم تھے یا جن کو اس کی سن گن لگ گئی تھی وہ مختلف جہات سے مولانا آزاد کی امامت سے خوش نہیں تھے بعض اختلاف مسلک فقہی کے زیر اثر، بعض مولانا آزاد کی بعض غیر ثقہ عادات (مثلاً تمباکوکشی) غیر عالمانہ سج دھج اور رئیسانہ طرز معاشرت، اور بعض مولانا کی کم عمری کے پیش نظر متذبذب اور متامل تھے، لیکن ہمت وجرأت نہ ہونے کی بنا پر دم بخود تھے اور جب مولانا معین الدین نے ان کے جذبات کو زبان دی اور انتخاب ملتوی کروا دیا تو پھر علماء کے مختلف گروہ بیدار و فعال ہو گئے اور تحریک پس منظر میں چلی گئی، مولانا آزاد اور

(حاشیہ متعلق صفحہ سابقہ)

یاد دلایا" (ص۹ ہندوستان اور مسئلہ امارت - از مولانا عبدالصمد رحمانی، ۱۹۶۹ء)

مولانا ابوالحسن علی لکھتے ہیں :

"اس سلسلے میں قیادت و رہ نمائی اور سبقت و اوّلیت کی سعادت اللہ تعالیٰ نے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب بہاری کی قسمت میں لکھی تھی .... امارت شرعیہ کے قیام کی تحریک اور اس کا علمی و فقہی دستوری خاکہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل دردمند اور فکر ارجمند کا نتیجہ ہے"

(ص۲۲ امارت شرعیہ از مولانا محمد ظفر الدین مفتاحی ۱۹۷۴ء)

اسی طرح امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے ادبیات میں مولانا آزاد کا نام داعی اول کی حیثیت سے نہیں لیا گیا، لیکن خود مولانا آزاد کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالمحاسن کو مولانا آزاد نے ہی متوجہ کیا تھا، جب کہ مولانا کے عہد امارت میں رانچی (بہار) میں ان سے ملے تھے (خطبہ صدارت اجلاس لاہور) نیز وہ ان کی طرف سے اس کام پر مامور بھی تھے - ص۶۴ تحریک نظم جماعت ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہانپوری)

ان کے ہم نوا اور معتقدین جاری رہیں اس لئے ستمبر ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ کی مجلس منتظمہ کا اجلاس بلایا گیا مگر اب ناموافق اور خاموش و تذبذب گروہ فعال ہو چکا تھا۔ اس لئے اس گروہ نے مولانا معین الدین کو تنظیم کے اجلاس میں شرکت کو مرکز کرنا چاہا۔

"علماء دہلی کا خیال ہے کہ فقیر خصوصیت سے اس جلسے میں شریک ہو"
(مکتوب)

مسیح الملک اجمل خان کے متعلق ان کے فرزند حکیم جمیل خان نے سیرت اجمل میں لکھا ہے کہ وہ

"اس تجویز سے سخت مخالفت رکھتے تھے اور اسے خطرناک سمجھتے تھے"
(سیرت اجمل ص ۱۶۵ سنہ ۱۹۴۶ء)

بہر حال مجلس منتظمہ نے اس مسئلے کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اس کا اندازہ آپ کو مولانا آزاد کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے۔

"گزشتہ موسم گرما میں اس طرف سے مایوسی ہو گئی کہ تمام ملک کیلئے کوئی متفقہ و متحدہ نظم قائم ہو" (خطبہ صدارت)

اس کے فوراً البدیہ طے کر لیا گیا کہ پہلے صوبوں میں امارتیں قائم کی جائیں کل ہندامارت کی جلد کوئی توقع نہیں رہی۔ چنانچہ بہار و اڑیسہ میں تو امارت شرعیہ قائم بھی کر دی گئی، جو پہلی بھی تھی اور افسوس کہ آخری بھی،

ضروری اور زیادہ اہم بات یہ کہی گئی ہے کہ مولانا معین الدین نے اپنی تقریر میں مولانا آزاد کو ناموزوں قرار دیتے ہوئے انہیں مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

"ایاز قدر خود بشناس! کہاں تم اور کہاں یہ رفیع و عالی منصب، تم ایسے نوعمر کو تو اکابر علماء کی موجودگی میں زبان کھولنا بھی مناسب نہیں ہے، رہا تمہارا علم و فضل تو اس کا بھانڈا ابھی پھوٹا جاتا ہے، ذرا منطق کی فلاں کتاب کی عبارت تو پڑھ کر سنا دو" (میثاق)

اور راوی ہیں پروفیسر یوسف سلیم چشتی، تو جس طرح چشتی صاحب کے کبر سن کے حافظے نے ۱۹۲۰ء کو ۱۹۲۲ء بنا دیا تھا اسی طرح یہ تقریر بھی بے اصل و بے اساس ہے۔

اوّلاً اس لئے کہ ہم مولانا معین الدین کے اہل حلقہ نے اس واقعے کے سلسلے میں یہی نہیں بلکہ اس ملتی جلتی بات بھی نہیں سنی، حتاں آنکہ مولانا کے متعدد اصحاب سے یہ واقعہ سنا ہے اور انہوں نے خود مولانا سے سنا تھا بلکہ شاید مولانا کے برادر خورد مولانا غازی محی الدین تو اس اجلاس میں شریک بھی تھے۔

ثانیاً مولانا معین الدین کا یہ انداز گفتگو ہی نہیں تھا نہ ان جیسے عالی ظرف اور شائستہ بزرگ کے شایان شان یہ زبان ہے۔

ثالثاً مولانا معین الدین اور مولانا آزاد کے روابط ہمیشہ مخلصانہ رہے اور دونوں ایک دوسرے کے قدرشناس اور مدح سرا رہے، محترم حکیم نصیر الدین ندوی صاحب ان دونوں حضرات کی بہت سی ملاقوں، طویل طویل نشستوں، علمی مذاکرات اور محافل خورد و نوش کے شاہد ہیں۔

رابعاً مولانا معین الدین خود اس وقت ۳۹ سال کے تھے اس لئے مولانا آزاد پر نوعمری کا طعن تو ان پر سجتا بھی نہیں، جو ۳۳ سال کے تھے۔

خامساً منطق کی کسی کتاب کی عبارت تو عبارت خوانی کے امتحان کے لئے موزوں بھی نہیں ہوتی، منطق و حکمت کی کتابوں کی عبارات کا مفہوم تو بے شک عسیر الفہم اور عام علماء ہی نہیں خواص کی دسترس سے بھی بلند ہوتا ہے مگر عبارات میں ذخیرہ الفاظ محدود اور زیادہ تر اصطلاحات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ہاں ادب و تاریخ کی کتابوں میں بے شک ذخیرہ الفاظ وافر و لامحدود ہوتا ہے عبارت آرائی ہوتی ہے، زور کلام ہوتا ہے، غرائب اللغات ہوتے ہیں، اس لئے عبارت خوانی کے امتحان میں وہ کارآمد اور صلاحیت آزما ہوتی ہیں۔

سادساً، خود مولانا آزاد نے اپنے لئے دعوت کب دی تھی، جو ان کی عمر اور ان کے علم کو معرض نقد و افکار میں لایا جاتا۔

سابعاً، التوا انتخاب و بیعت کے لئے یہ نکتہ کیا کم مؤثر تھا کہ اتنا اہم فیصلہ اس عجلت میں مناسب نہیں امتحان لینے کی کیا ضرورت تھی؟

واقعہ یہ ہے کہ غور و فکر کی مہلت طلبی کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ مولانا آزاد کے حامیوں کو بھی اس کی معقولیت تسلیم کرنی پڑی اور مذبذبین و منکرین کو بھی حیلہ ہاتھ آگیا اور انتخاب معرض التوا میں جا پڑا، ○○○

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ــــــ اور
بعثتِ محمدی کی تمامی و تکمیلی شان ــــــ نیز
انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ــــــ

ایسے اہم موضوعات پر

ڈاکٹر اسرار احمد
کی
حد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجیے

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ ۴ روپے

مرکزی انجمن خدام القرآن ○ ۲۶۰ کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

ــــ نبی اکرم کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
ــــ کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ:ــــ
کیا ہم آپ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے ــــ

ــــ اس اہم موضوع پر ــــ
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے

ہدیہ فی نسخہ: تین روپے۔ تبلیغی مقصد کے لیے یک صد نسخوں پر ۳۳ فی صد کمیشن دیا جائے گا:

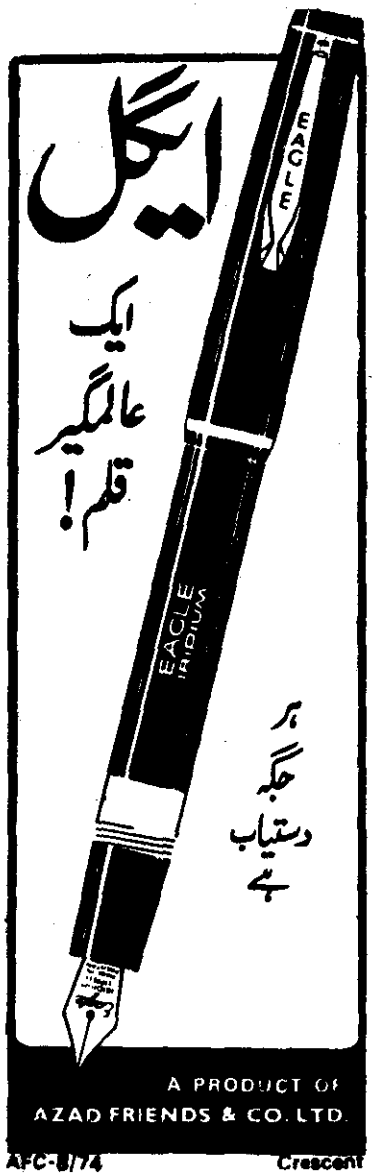

ہندوستان میں "مسلم پرسنل لاء" کے مسئلے پر

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ

کا خصوصی انٹرویو

گذشتہ "میثاق" میں ہندوستان میں "مسلم پرسنل لاء" کے سلسلہ میں ایک قیمتی اور اہم مضمون شامل کیا گیا تھا ـــ اس مرتبہ اسی سلسلے میں ایک نہایت درجہ قیمتی اور فکر انگیز انٹرویو شامل کیا جا رہا ہے۔

یہ انٹرویو ہندی ہی نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کے محبوب رہنما اور مخلص قائد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ہے، جو صدر ہیں "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" کے اور جن سے انٹرویو لیا "ادارہ صحافت اسلامیہ" کے جناب نذر الحفیظ ندوی نے۔ ہندوستان میں بہت دنوں سے یہ مسئلہ پریس وغیرہ میں آ رہا تھا۔ حال ہی میں ہندی عدالت عالیہ نے شاہ بانو کیس میں جو فیصلہ دیا ـــ اس کے بعد اس میں بہت شدت پیدا ہو گئی اور اس "شر" کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ہندی ملت مسلمہ کو بیداری باہمی اتحاد اور جہد و عمل کی دولت سے سرفراز فرما دیا، جس کے اثرات بحمد اللہ تعالیٰ وہاں مرتب ہو رہے ہیں۔

مولانا کے انٹرویو سے اس مسئلہ کی اہمیت اور مسلمانوں کی جد و جہد کے گوشے سامنے آئیں گے جن میں دنیا بھر کے مسلمانوں بالخصوص پاکستانی مسلمانوں کے لیے ایک سبق و عبرت ہے۔ پاکستان جیسی نظریاتی مملکت میں ایوب خان مرحوم کے دور میں مسلم عائلی قوانین کا جھٹکا ہوا ایوب خان، یحییٰ خان اور بھٹو صاحب کے بعد اب جو بھی حکومت ہے جسے اسلامی خدمات کا بڑا دعویٰ ہے لیکن یہ قوانین جوں کے توں ہیں حتیٰ کہ "شرعی عدالت" میں انہیں چیلنج نہیں کیا جا سکتا ـــ یہ بات جہاں حکمرانوں کے لیے غور طلب ہے وہاں اس ملک کے علماء اہل دین اور دینی جماعتوں کے لیے بھی ایک تازیانہ ہے ـــ دیکھیں تحفظ شریعت کا سہرا کس رجل رشید کے سر بندھتا ہے؟

(ادارہ)

سوال : آپ نے اپنے سیاسی خیالات، علمی و دینی مشاغل کی سرگذشت اور ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق بعض ایسے اہم انٹرویو دیے ہیں، جو اس ملک میں ملی اور دعوتی جدوجہد کی تاریخ میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ پر قلم اٹھانے والا کوئی مؤرخ ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر فروری ۱۹۷۱ء میں "ندائے ملت" کے لیے آپ نے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، اس کے بعد تحریک "پیام انسانیت" کے متعلق تفصیلی انٹرویو دیے۔ جن سے بہت سے حقائق آشکارا ہوئے، اب ہم پھر آنجناب کو ایک ایسے مسئلہ پر بعض وضاحتوں کی زحمت دینا چاہتے ہیں، جس نے کچھ عرصہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ہماری مراد مسلم پرسنل لا سے ہے، لیکن مسلم پرسنل لا سے متعلق بعض اہم مسائل پر گفتگو سے قبل ہم اس بورڈ کی صدارت کے بارے میں سوال کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ آپ نے مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت اپنے مخصوص مزاج اور غیر معمولی علمی و دعوتی مصروفیات، نیز سابقہ روایات کے خلاف کیوں قبول کی، جب کہ اس سے پہلے (جہاں تک ہمیں یاد ہے) مسلم مجلس مشاورت کی صدارت آپ نے ڈاکٹر سید محمود صاحب جیسی محترم شخصیت کے اصرار پر بھی نہیں فرمائی، آخر اس کے اسباب کیا ہیں؟

جواب : آپ نے ایک اچھی تمہید کے بعد جس نے مجھے واقعات کی بعض بھولی ہوئی کڑیاں یاد دلا دیں اور ایک مناسب انداز کے ساتھ مجھ سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت قبول کرنے کے بارے میں سوال کیا ہے، واقعہ ہے کہ میری افتادِ طبع، خاندانی روایات اور مشاغل کی نوعیت سے جو لوگ واقف ہیں، ان کو اس بارے میں ضرور ایک تضاد سا محسوس ہوتا ہے۔

جن لوگوں کو میرے مضامین و رسائل اور کم سے کم سرگذشتِ حیات" کاروانِ زندگی" پڑھنے کا موقع ملا ہے، وہ جانتے ہیں کہ میں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے اجتماعی اور تنظیمی کاموں میں سے دو کاموں کی سب سے زیادہ اہمیت محسوس کی ہے، اور یہ ملتِ اسلامیہ کی روح، مزاج، اس کے مقاصد و پیغام سے کسی حد تک واقفیت اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

(۱) ایک ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ نسل کے ایمان و عقیدہ کی حفاظت اور ان کے

معنوی اور روحانی تسلسل کو برقرار رکھنے اور نہ صرف ذہنی اور تہذیبی بلکہ (خاکم بدہن) اعتقادی ارتداد سے بچانے کے لیے مسلمان بچوں کی تعلیم کا انتظام اور ان کی طرف اسلامی ورثہ کی منتقلی اور ان کو اس کا حامل و محافظ بنانے کی جدوجہد۔

(۲) دوسرے اِس ملت کو ہندوستان جیسے ملک میں (جو مذاہب، تہذیبوں اور قومیتوں کا گہوارہ ہے) اپنے ملی تشخص کے ساتھ اور ایک ایسی صاحب شریعت ملت کی حیثیت سے باقی رکھنے کی جدوجہد، جس کا رشتہ آسمانی تعلیمات اور الٰہی قانون کے ساتھ استوار ہے، اور جس کے یہاں دین کا مفہوم عقائد و عبادات کے دائرہ میں محدود نہیں، پوری زندگی پر حاوی ہے، اور جو اپنا مستقل عائلی (خاندانی) نظام و قانون رکھتی ہے، جو اِس کے دین کا جزء اور کتاب و سنت کے صریح احکام و ہدایات پر مبنی ہے، اور ایک مسلمان کے لیے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

اِس احساس و شعور اور فکر و مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ جب ۱۹۵۹ء کی آخری اور ۱۹۶۰ء کی ابتدائی تاریخوں میں قاضی محمد عدیل عباسی صاحب مرحوم کی دعوت پر بستی میں صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی اور اجلاس کی صدارت کا قرعۂ فال میرے نام نکلا تو میں نے بلا تکلف اس کو قبول کیا پھر جب اس کی مستقل صدارت کے لیے میرا انتخاب ہوا، تو میں نے ادائے فرض کے اس احساس سے اس ذمہ داری کو قبول کیا، اور ابھی تک ایک سعادت و عبادت سمجھ کر اور کم سے کم ہندوستان میں اس کو ایک اہم خدمت باور کر کے اس ذمہ داری کو نباہ رہا ہوں۔

یہی حال مسلم پرسنل لا بورڈ کے مسئلہ کا ہے، ملک کی آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک دوسرا خطرہ نمودار ہوا، وہ حکومت کا یہ رجحان اور پھر مسلمانوں کے ایک تجدد پسند اور آزاد خیال گروہ کا یہ مطالبہ تھا کہ ہندوستان میں سارے فرقوں کا ایک مشترک عائلی قانون (UNIFORM CIVIL CODE) ہو کہ اس کے بغیر قومی وحدت اور یک رنگی نہیں پیدا ہو سکتی، یہ خطرہ اندیشہ سے بڑھ کر واقعہ کی شکل میں سامنے آنے لگا، خود حکومت کے بعض محتاط لیکن معنی خیز بیانات وقتاً فوقتاً اس اندیشہ کو تقویت پہنچاتے تھے۔ خود مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو ایک مہم اور تحریک کی طرح اس کو چلا رہا تھا، یہ مسلمانوں کے تہذیبی اور معاشرتی ارتداد اور شریعت اسلامی

سے بغاوت اور اس کے برکات سے محرومی کا پیش خیمہ اور ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴾ "اور جو کوئی اللہ کے نازل کیے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ کافر ہیں) کی وعید کا مصداق بنانے والا فتنہ تھا۔

اِس خطرہ کا احساس جن لوگوں کو ہُوا، واقعہ یہ ہے کہ ان میں مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ پیش پیش تھے، انہوں نے ہر وقت رہنمائی کی اور اس کے خلاف ایک منظم مہم اور تحریک چلانے اور ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا، طے ہُوا کہ ۲۷/۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں مسلم پرسنل لا کنونشن بلایا جائے میں اور رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی اس سال رابطۂ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے (جو ماہ ذیقعدہ میں ہُوا کرتا تھا) حجاز مقدس گئے ہوئے تھے، اور قدرۃً حج سے فراغت کے بعد واپسی کا پروگرام تھا، لیکن مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم لوگوں نے ایسے وقت ہندوستان آنے کا فیصلہ کیا جب حج میں صرف پندرہ بیس دن باقی تھے، اور بمبئی کنونشن میں شرکت کی، یہاں اس ادارہ کے قیام کی تاریخ اور تفصیلات کا بیان کرنا مقصود نہیں، صرف دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے ـــ ایک یہ کہ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی ایسی مکمل نمائندگی اس سے پہلے کم دیکھنے میں آئی تھی جیسی اس کنونشن کے موقع پر نظر آئی، دوسرے یہ کہ اس اجلاس کے نتیجہ میں ایک آل انڈیا مسلم پرسنل لأ بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی۔ جس کے صدر بالاتفاق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم اور جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی قرار پائے۔

قاری صاحب مرحوم (جن کو اللہ تعالیٰ نے ایک دلآویز اور ہمہ گیر شخصیت عطا فرمائی تھی) کی صدارت کی موزونیت پر تقریباً سب کا اتفاق تھا۔ رانچی کے سالانہ اجلاس ۱۹۷۷ء کے موقع پر صدارت میں تبدیلی کا مسئلہ زور شور سے اٹھا، بعض حلقوں کی طرف سے میرا نام پیش کیا گیا۔ لیکن میرے یہ کہنے پر سب خاموش ہوگئے کہ "طوفان میں کشتی نہیں بدلی جاتی۔" میرے لیے اِس کا ایک بڑا محرک یہ بات بھی تھی کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب جیسا باوقار اور ہر دلعزیز صدر ملنا مشکل ہے اور آل انڈیا مسلم پرسنل لأ بورڈ جیسے مشترک ادارہ کی صدارت کے لیے وہی موزوں ہیں لیکن ۱۷ جولائی ۱۹۸۳ء کو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اِس دارِ فانی سے رحلت کی اور ان کی جگہ خالی

ہوگئی۔ اس سال ۲۸/۲۹ دسمبر ۱۹۸۳ء میں مدراس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سالانہ اجلاس کا ہونا طے پایا۔ میں اپنے بعض بیرونی پروگراموں اور خرابیٔ صحت کی بنا پر اس سے پہلے کے عاملہ کے بعض اجلاسوں میں شرکت نہیں کرسکا تھا، اس اجلاس میں شرکت کا عزم مصمم تھا۔ اور سفر کے سب انتظامات کرلیے گئے تھے کہ عین موقع پر مجھ پر نقرس (GOVT) کی بیماری (جس کا میں پرانا مریض ہوں) کا شدید حملہ ہوا اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں ایسی شدید تکلیف میں مبتلا ہوا کہ چارپائی سے اترنا مشکل تھا۔ مجبوراً سفر کے التوا کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اجلاس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا نام صدر کی جگہ کے لیے پیش کیا گیا۔ جو لوگ میری طبیعت سے واقف ہیں، انہوں نے یہ کہا کہ وہ صرف اس صورت میں منظور کرسکتے ہیں کہ متفقہ طور پر ان کا انتخاب عمل میں آئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ بغیر کسی اختلاف کے میرا نام منظور ہوا۔ جب مجھے اس کی اطلاع ہوئی تو "سنگ آمد و سخت آمد" کا مضمون تھا۔ یہ فیصلہ میری افتادِ طبع، صحت جسمانی، عمر اور دوسری ذمہ داریوں اور مشغولیتوں سے میل نہیں رکھتا تھا۔ اگر یہ کسی بھی سیاسی، ملی، تنظیم اور باعثِ افتخار و اعزاز منصب کے قبول کرنے کا معاملہ ہوتا تو میں بغیر کسی ادنیٰ تردد کے انکار کردیتا۔ لیکن ایک تو مسئلہ کی نوعیت و اہمیت کی وجہ سے جس کو میں اپنے عقیدہ کا جزو اور مسلمانوں کی ملی زندگی کے لیے شہ رگ کا درجہ دیتا ہوں۔ دوسرے مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کے احترام کی بنا پر جن کا بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رح کے فرزند ہونے کی وجہ سے ہمیشہ لحاظ کرتا رہا ہوں، چاروناچار قبول کرنا پڑا۔ دوستوں کی اس بات کو بھی اس میں دخل تھا کہ اس وقت بورڈ کو اختلاف و انتشار سے بچانے کے لیے بھی ایسا کرنا ضروری ہے، چنانچہ فارسی کے اس پرانے شعر پر عمل کرنا ہی پڑا۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے صدارت قبول کرنے کے کچھ عرصہ بعد ہی نہ صرف بورڈ کی تاریخ میں بلکہ ملتِ اسلامیہ ہند یہ کی تاریخ میں ایسے سنگین مرحلے پیش آئیں گے، جو شاید اس سے پہلے پیش نہیں آئے اور جن میں قیادت کے غیر معمولی حزم و عزم، ملت کے نظم و ضبط، علمائے دین و ماہرین قانون کے علم و مطالعہ، ذہانت اور تدبر اور

عوام کے انقیاد و اطاعت، صبر و تحمل، قائدین پر اعتماد اور تفویض و تسلیم کی غیر معمولی صلاحیت کے ثبوت دینے اور ملی شعور کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ میرا اشارہ خاص طور پر نفقۂ مطلقہ کے بارے میں سپریم کورٹ کے اس ہنگامہ خیز فیصلہ کی طرف ہے جو ۲۳ر اپریل ۱۹۸۵ء میں دیا گیا اور جس نے ملت کو اپنے دین و شریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری اور غیرت و خودداری کے ایک فیصلہ کن مرحلے پر لا کھڑا کر دیا۔ تدبیر الٰہی کی کارفرمائی تھی (جس کی حکمتوں کو کوئی نہیں جانتا) کہ یہ نازک اور فیصلہ کن مرحلہ (جو اگر کامیابی کے ساتھ گذار لیا گیا اور ملت نے اس میں فتح حاصل کر لی تو عرصۂ دراز تک کے لیے انشاء اللہ مسلمانوں کا عائلی قانون عدالتوں کا تختۂ مشق بننے سے بچ جائے گا) مجھ ناتواں کے دورِ صدارت میں پیش آیا۔ جو سخت جسمانی جد و جہد، قوتِ برداشت اور فرصتِ فراغت کا طالب ہے، شاید یہ بات غیرتِ الٰہی اور رحمتِ الٰہی دونوں کو حرکت میں لانے کا باعث بن جائے جن کے بغیر اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے قائدین اور اولوالعزم مصلحین بھی کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ "وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ" (نصرت تو بس زبردست اور حکمت والے اللہ ہی کی طرف سے ہے۔)

سوال: کیا آپ مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کے لیے بورڈ کی اب تک کی کارگذاری پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

جواب: آپ کو معلوم ہے کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کا اجلاس اس سال اپریل ۱۹۸۵ء میں کلکتہ میں ہوا تھا۔ بورڈ کے اس جلسہ میں اس کی سابقہ روایات کے مطابق مسلمانوں کے مختلف حلقوں کی نمائندگی تھی، اور تقریباً تمام مسلم جماعتیں اور تنظیمیں اور مکاتبِ فکر اور مذہبی فرقے شامل تھے۔ میرا خطبہ زبانی تھا جو اردو اور انگریزی میں چھپ گیا ہے اور جس میں مسئلہ کی اہمیت اور نوعیت پر اصولی اور علمی اور حقیقت پسندانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے آخری اجلاس شہید مینار چوک میں ہوا۔ جس میں محتاط اندازہ کے مطابق ۵ لاکھ انسان تھے میں نے ضرورت سمجھی کہ اس میں خاص طور سے مسلمانوں کو مخاطب کیا جائے اور خود ان کا دینی اور عملی احتساب کیا جائے کہ وہ خود قانونِ خداوندی پر کتنا عمل کرتے ہیں۔ انہوں نے اس کے بارے میں جو رویہ اختیار کر رکھا ہے، اس کا غیبی اور اخلاقی اثر کیا پڑ رہا ہے، یہ خطبہ بھی چھپ گیا ہے۔

اِس کے بعد دہلی میں عاملہ کے دو اجلاس ہوئے، پہلا اجلاس ۱۴ ارمئی اور دوسرا اجلاس ۱۰ رجولائی کو دہلی میں ہوا جس میں وزیرِ اعظم راجیو جی سے بورڈ کے ایک نمائندہ وفد کا ملناطے ہوا۔ . . . . .

۳۰ رجولائی ۱۹۸۵ء کو وفد نے وزیرِ اعظم کو یادداشت پیش کی اور اس کے بعد ایک منفصل نوٹ جو بہت غور وفکر اور مشورہ وتبادلۂ خیال کے بعد مرتب ہوا تھا، پیش کیا گیا جس میں ان کے لیے مسئلہ کو سمجھنے کے لیے پورا مواد اور ضروری معلومات فراہم کی گئی تھیں اور یہ کہ ان کے بلیے اب مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے کون سا دستوری اور عملی آسان راستہ ہو سکتا ہے۔

اِس سلسلہ میں اتنا اور کہتا چلوں کہ مَیں نے بحیثیت صدر کے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ راجیو جی! میری عمر اب ۷۲/۷۳ سال کی ہو رہی ہے، میں نے آپ کے نانا موتی لال جی کو بھی دیکھا ہے اور ان کی تقریر امین آباد پارک لکھنؤ میں سنی ہے۔ اور جواہر لال نہرو اور اندرا جی کو تو بہت قریب سے دیکھا ہے، اور ان کا اچھا زمانہ پایا ہے۔ لکھنؤ میں رہنے اور خاص طرح کے خاندانی اور تعلیمی ماحول کی وجہ سے تحریکِ خلافت اور تحریکِ آزادی سے لے کر ایسی کوئی تحریک نہیں تھی، جس کا میں نے قریب سے مطالعہ نہ کیا ہو۔ اور اس کے اثرات نہ دیکھے ہوں۔ میں اپنی اِس طویل واقفیت کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کسی مسئلہ پر کم سے کم مسلمانوں کے ہر مکتبِ خیال سیاسی جماعتوں، پارٹیوں اور تنظیموں اور افراد کا ایسا مکمل اتحاد واتفاق دیکھنے میں نہیں آیا، جیساکہ مسلم پرسنل لا کے تحفظ پر عمومیت کے ساتھ اور سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کے خلاف خصوصیت کے ساتھ دیکھنے میں آرہاہے۔ راجیو جی نے یہ باتیں غور سے سُنیں، اور ان پر کوئی جرح نہیں کی، پھر دوسرے معزز ارکانِ وفد نے (جن میں جناب غلام محمود بنات والا، سید شہاب الدین اور الحاج ابراہیم سلیمان سیٹھ زیادہ نمایاں تھے) مسئلہ پر روشنی ڈالی اور پُر مغز طریقہ پر اس کی وکالت کی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لأ بورڈ نے جب رمضان المبارک میں جمعۃ الوداع کو یومِ تحفظ شریعت منانے کا فیصلہ کیا تو پورے ملک میں بڑے وقار واحترام اور کسی نعرہ بازی اور ہنگامے کے بغیر یہ دن منایا گیا، مساجد میں تقریریں کی گئیں، اور وزیرِ اعظم اور وزیرِ قانون کو احتجاجی ٹیلی گرام اس کثرت سے روانہ کیے گئے کہ اس سے پہلے شاید ایسا ہُوا ہو، اسی طرح

جب تحفظِ شریعت کا ہفتہ منانے کا فیصلہ کیا گیا تو مسلمانوں کے مختلف مسلک رکھنے والی جماعتوں اور مکاتبِ فکر نے تحفظِ شریعت کا ہفتہ منانے میں کسی جماعتی عصبیت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انہوں نے اس موقع پر مکمل ہم آہنگی، اتحاد جذبۂ تعاون اور ملی غیرت وحمیت کا ایسا ثبوت دیا ہے اور دے رہے ہیں، جس کی تمنا عرصہ سے تھی اور اگر یہ کہوں تو بے جا بات نہ ہوگی کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ نے مسلمانوں کے اندر اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے کا ایسا کام کیا جو شاید بڑی جد وجہد کے بعد بھی اس طرح انجام نہ پایا ہوتا۔ تحفظِ شریعت کا ہفتہ بہار و اڑیسہ اور یوپی میں منایا جا چکا، دوسری ریاستوں میں باقی ہے[1]، ہر جگہ جلسے غیر معمولی طور پر کامیاب رہے اور سالہا سال کے بعد مسلمانوں میں وہ جوش و خروش جلسوں میں حاضرین کی تعداد اور کام کرنے والوں میں ہم آہنگی دیکھنے میں آئی جس کا مشاہدہ برسوں سے نہیں ہوا۔ کانپور کے جلسہ میں لوگوں کا اندازہ پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک کے درمیان تھا، مراد آباد میں بھی ہزاروں کی تعداد تھی۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ اپنے مخصوص موضوع و مقصد (تحفظِ شریعت) اور مشترک عائلی قانون کی مخالفت کے علاوہ مسلمانوں میں عام بیداری کا سبب بن جائے گا اور ان کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کسی مسئلہ پر متفق ہو کر اپنی زندگی کا ثبوت دے کر کتنے بڑے کام انجام دے سکتے ہیں اور کتنے بڑے خطرات سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔

سوال: مسئلہ کے اس روشن پہلو اور افادیت کے ساتھ جو ہر مسلمان بلکہ ہر محبِّ وطن کے لیے تسلی بخش ہے، آپ کو اس سلسلہ میں سب سے بڑا خطرہ کیا محسوس ہوتا ہے۔

آپ نے نہ صرف ہندوستان کی بلکہ امتِ اسلامیہ کی علمی، فکری، اصلاحی اور تجدیدی تاریخ لکھی ہے، اور آپ نے عالمِ اسلام کا رباط و مراکش سے لے کر سری لنکا و بنگلہ دیش تک کا سفر کیا ہے اور ان ملکوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ اور خطرات سے ہوشیار کیا ہے، ہم آپ سے یہ سننا چاہتے ہیں کہ اس سفر میں (جو ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے) سب سے زیادہ دشوار گذار گھاٹی کون سی ہے، جس

---

[1] اس انٹرویو کے بعد کشمیر، پنجاب، آندھرا پردیش، تامل ناڈو اور کرناٹک میں بھی وفد کا دورہ ہوا اور عظیم اجتماعات اور جلسے منعقد ہوئے۔

سے آپ سب سے زیادہ خطرہ محسوس کرتے ہوں۔

جواب: آپ نے یہ سوال کرکے میرے دل و دماغ کے داغ کہن تازہ کردیئے اور "ناگفتنی" کو "گفتنی" بنادیا، مجھے یہ ناخوشگوار فرض انجام دینا ہی پڑے گا، بقول اقبال ؎

چمن میں تلخ نوائی میری گوارہ کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

مجھے سب سے بڑا خطرہ (جو اب خطرہ نہیں رہا بلکہ مشاہدہ بنتا جارہا ہے) مسلمانوں کی ان دو کمزوریوں یا بیماریوں سے ہے، جو دل پر پتھر رکھ کر کہتا ہوں کہ ہندوستان کی حد تک قلی مزاج بنتا جارہا ہے، ایک عجلت و بے صبری، وہ یہ کہ مسئلہ کتنا ہی طویل المیعاد، صبر آزما اور پیچیدہ ہو، یہاں کے مسلمان ہتھیلی پر سرسوں اگانے کے قائل ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جو مہم صبح شروع ہوئی ہے، وہ سورج غروب ہونے سے پہلے کامیاب ہونی چاہیئے اور بیل منڈھے چڑھ جانی چاہیئے، مسائل کو کامیابی سے حل کرنے میں ایک بڑا فیکٹر — (FACTOR) صبر و تحمل، قوت برداشت اور بلند حوصلگی ہے۔ مسلمانوں ہی کی تاریخ نہیں، تمام زندہ و فاتح قوموں کی تاریخ (خود سیرت نبوی سے بڑھ کر ہمارے لیے کوئی اسوہ و نمونہ نہیں) تلخ و شیریں، سرد و گرم، نشیب و فراز کے مناظر کا مجموعہ اور ایک طویل، آزما، زہرہ گداز جدّ و جہد کی روداد ہے، تحریکات اور مہمات کی تاریخ بھی ہمیں یہ سبق دیتی ہے۔ لیکن ہندوستانی مسلمانوں کا مزاج اس کے برخلاف معرکہ کو چٹکیوں میں فتح کرلینے کا قائل ہے۔

ابھی ستمبر کے دوسرے ہفتہ میں میں بمبئی میں تھا، وہاں مہاراشٹر مسلم پرسنل لا بورڈ کی ایکشن کمیٹی کا جلسہ تھا۔ مجھے بھی اس میں شرکت کا موقع ملا۔ سنجیدہ اور تعمیری انداز میں گفتگو کا سلسلہ جاری تھا اور ہفتۂ تحفظ شریعت منانے کے لیے ضروری اقدامات پر غور کیا جارہا تھا کہ اچانک ایک نوجوان کھڑے ہوئے اور انہوں نے ایک مضمون پڑھنا شروع کیا کہ زندہ قوموں اور ملکوں کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی جماعت کسی مسئلہ کے حل کرنے میں ناکام ہوجاتی ہے تو پیچھے ہٹ جاتی ہے اور دوسروں کے لیے جگہ خالی کردیتی ہے، اتنی طویل مدت ہوگئی اور مسلم پرسنل لا بورڈ مسئلہ کو حل نہیں کرسکا اس لیے اس کو اب اپنی ناکامی کا اقرار کرلینا چاہیئے اور دوسروں کو کام کا موقع دینا چاہیئے۔ یہ سُن کر

اپنی افتادِ مزاج کے برخلاف میرے اندر سخت تاثر پیدا ہُوا اور مَیں نے کہا کہ یہ ایک مریضانہ ذہنیت کی علامت ہے۔ آپ نے برادرانِ وطن کے کردار کا بھی مطالعہ کیا ہے؟ انہوں نے تحریکِ آزادی کے سلسلہ میں، نیز اپنے تعمیری منصوبوں کی تکمیل میں کتنے صبر و تحمّل سے کام لیا اور اپنے رہنماؤں کو کام کرنے کا کتنا طویل موقع دیا، گاندھی جی ہوں یا مالوی جی یا دوسرے ہندو سیاسی لیڈر اور قومی معمار، انہوں نے کتنے سکون و اطمینانِ قلب کے ساتھ کام کیا۔ دو ہی دن بعد قوم نے ان کا دامن جھٹکنا اور گریبان پکڑنا نہیں شروع کیا۔ مسلمانوں کو تو صبر و تحمل کا زیادہ عادی ہونا چاہیئے کہ ان کا صحیفہ اور ان کے نبیؐ کا اسوہ اور خدا کی قدرت کاملہ پر یقین ان کو زیادہ وسیع القلب اور وسیع النظر بنا دیتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اُلٹا معاملہ ہے۔

مسلمانوں کی دوسری کمزوری جو اب ایک نیشنل کیریکٹر کا رنگ اختیار کر گئی ہے، وہ ان کی اپنے قائدین کے بارے میں بد اعتمادی، بد گمانی، شدید احتساب، بے ضرورت تنقید اور کردار کشی ہے۔ پھر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ برادرانِ وطن کا اپنے سیاسی، تعلیمی، تعمیری رہنماؤں اور سماجی کام کرنے والوں کے بارے میں رویّہ بالکل مختلف ہے۔ اپنے رہنماؤں سے بلند اخلاقی معیار، ہر شک و شبہ سے بالاتر دیانت کی توقع، اسلامی تعلیمات اور اسلامی تصوّرات کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس میں اس حد تک افراط و غلو کہ ہر کام بد گمانی سے شروع کیا جائے اور ہر قائد و خادمِ ملّت کو بے اعتمادی اور بے توقیری کی نظر سے دیکھا جائے اور اس پر بڑے سے بڑا الزام لگانے میں پس و پیش نہ کیا جائے۔ اس کے بارے میں بعید از قیاس سے بعید از قیاس بات کو فوراً باور کر لیا جائے۔ افواہ پھیلانے اور ان کو مان لینے میں ذرا بھی احتیاط و تامل سے کام نہ لیا جائے، ایک ایسی مہلک بیماری ہے جو پورے شیرازۂ ملّت کو درہم برہم کرنے کے لیے کافی ہے اور بڑے سے بڑے شیر دل، کوہ وقار اور پاک باز و پارسا خادمِ دین اور بڑے بڑے طوفانوں میں کشتیٔ ملّت کے سپھیرے ملّاح کا دل توڑ دینے اور اس کی ہمت پست کر دینے کے لیے کافی ہے۔ وہ دشمنوں کی اذیتوں، قید و بند کی سزاؤں، بچوں اور افرادِ خاندان کے فاقے کو برداشت کر سکتا ہے اور اس کی پیشانی پر شکن نہیں آسکتی ہے۔ لیکن اتہام اور الزام، کردار کشی اور ملّت کا غدّار بنائے جانے سے

اُس کا دل چُور چُور ہوجاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑجاتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ایک بڑھیا کو حضرت عمرؓ کو ٹوکنے، ایک اعرابی کے سوال پوچھ لینے کی روایات کو ہمارے قومی جلسوں اور مجالس وعظ میں ایسے مبالغہ اور بے اعتدالی سے بیان کیا گیا ہے کہ ہر شخص نے اس کی تقلید شروع کردی ہے، چاہے امیر المؤمنین فاروق اعظمؓ کے مقام کا آدمی نہ ہو لیکن پوری قوم بڑھیا اور اعرابی کا کردار ادا کرنا چاہتی ہے۔ اکثریتی فرقے کا اپنے رہنماؤں اور کارکنوں کے بارے میں رویہ واضح طور پر اس کے برعکس ہے۔ اپنی دوسری کمزوریوں کے باوجود وہ نمایاں طور پر اس سلسلہ میں محتاط، فراخ دل اور وسیع النظر واقع ہوئے ہیں۔

سوال: مسلمانوں میں سے بعض "معروف" اشخاص نے "تجاہل عارفانہ" سے کام لیا ہے اور سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کے اس جزء کی حمایت کی ہے کہ مطلقہ کو سابق شوہر کی طرف سے جب تک وہ شادی نہ کرلے، جین حیات گذارا دیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے، اور اگر حق شریعت میں نہیں ہے، تب بھی اس کو مان لیا جائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے، کہ قانونِ شریعت کوئی چھوئی موئی نہیں ہے کہ ایسی چیزوں سے ٹوٹ جائے اور اگر اس میں تھوڑی سی ترمیم بھی ہوجاتی ہے تو بھی کوئی بڑی مصیبت نہیں آتی، یہ ائمہ کے اجتہادات ہیں جو وہ ہر زمانہ میں کرتے آئے ہیں اور ائمہ کو بت نہیں بنانا چاہیئے۔ نیز انہوں نے قرآن مجید میں "متاع" کے لفظ کی تشریح میں اور مطلقۂ بائنہ کو عدت کے بعد بھی گذارا دینے کو قرآنی سیاق وسباق سے الگ کرکے پیش کیا ہے، ان کے بارے میں ہمارے علمائے دین اور خاص طور پر آل انڈیا مسلم پرسنل لاٗ بورڈ کے مقتدر اراکین جو ہندوستان کے عظیم ترین اداروں کے سربراہ وذمہ دار ہیں، فتویٰ کی زبان کیوں نہیں استعمال کرتے اور ان پر فقہی حکم لگا کر مسلم معاشرہ سے خارج کیوں نہیں کرتے تاکہ دوسرے اس سے عبرت حاصل کریں اور ایسی جرأت سے کام نہ لیں؟

جواب: آپ نے ایک معقول بات پوچھی ہے، بورڈ کے دوسرے اہلِ علم ارکان اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہیں لیکن میرا ذاتی رجحان اور مشورہ یہ ہے کہ ہمارے علماء اور ہمارے مذہبی اداروں کو اس عہد اور ملک میں مسیحی یورپ کے قرون وسطی (جن کو قرون مظلمہ (DARK AGES) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کی طرح اعتقادات کی تحقیق

کی عدالتوں (COURT OF INQUISATION) جن کو عربی کتابوں میں "محاکم التفتیش" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کا کردار ادا کرنا مناسب نہیں جو اپنے نزدیک بد اعتقاد عیسائیوں کو دائرۂ اعتقاد سے خارج کیا کرتی تھیں اور ان کو لرزہ خیز سزائیں دیتی تھیں جس کی وجہ سے یورپ میں ایک طبقہ کلیسا سے بیزار اور عیسائیت سے متنفر ہو گیا۔ میرے خیال میں اس کے مقابلہ میں ہمیں مسلم معاشرہ میں وہ دینی شعور پیدا کرنا چاہیئے جو خود ان تجدد پسندوں یا برخود غلط فقیہوں اور مفسروں کا محاسبہ کرے اور ان کو محسوس کرائے کہ انہوں نے اپنے کو مسلم معاشرہ سے خود کو کاٹ لیا ہے، اور فتنہ کا ایک بہت بڑا دروازہ کھول دیا ہے۔ معاشرہ کا یہ طرزِ عمل ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے اور (اگر ان میں ذرا بھی ملی غیرت ہے تو) اپنی روش اور طرزِ عمل کی غلطی محسوس کرانے کے لیے کافی ہے۔ وہ یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ اس معاشرہ میں ایک فرد معاشرہ کی طرح رہنا اچھا ہوگا، جس کے ساتھ مرنا اور جینا ہے، اور جو دُکھ سکھ میں کام آتا ہے، یا اس عارضی عزت تعریف و تعارف کا خیال کرنا جو ڈھلتی چھاؤں اور بے وفا ساتھی ہے۔

سوال: ایک آخری سوال کی اور اجازت چاہتا ہوں جو اپنی اہمیت و افادیت میں پچھلے سوال سے کم نہیں اور میرے خیال میں بہت سے حساس اور حقیقت پسند مسلمانوں اور دانشور طبقہ کے ذہن میں یہ سوال گردش کرتا ہے۔

جواب: وہ سوال بھی ضرور کر لیجئے تاکہ مسئلہ کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔

سوال: آپ کے نزدیک اس مسئلہ اور اس اہم دینی و ملی مہم کے سلسلہ میں اب کرنے کے کیا کام ہیں اور آئندہ کا نظامِ عمل کیا ہوگا!

جواب: آپ نے بہت ضروری اور برمحل سوال کیا۔ اس انٹرویو میں بہت کمی رہ جاتی اگر یہ گوشہ سامنے نہ آتا۔ میرے نزدیک اوّلین اور اہم کام خود مسلمانوں میں شرعی، عائلی قانون پر عمل کرنے کی دعوت و تبلیغ ہے، جس کے اہم اور مرکزی اجزاء حقوق الزوجین اسلامی تعلیمات اور اسوۂ نبوی کے مطابق ازدواجی زندگی گزارنا، شفقت و محبت اور قرآنی الفاظ میں "وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً" کے اصول پر ایسی ازدواجی و عائلی زندگی گذارنا جس میں محبت و مودت اور رحمت کا عنصر غالب ہو، صلہ رحمی، ترکہ کی شرعی تقسیم، طلاق کے حق کا نہ صرف شرعی بلکہ مسنون طریقہ پر استعمال

ہو، اور "وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ" (اور اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس کے واسطہ سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے باب میں بھی تقویٰ اختیار کرو) کی اس ہدایتِ قرآنی پر عمل جو تمام انسانی، اسلامی و اخلاقی پہلوؤں اور گوشوں پر حاوی ہے، اس کے لیے ایک طوفانی مہم چلانے کی ضرورت ہے، جس کے اثر سے شہر تو شہر کوئی قصبہ اور گاؤں اور مسلمانوں کا کوئی محلّہ اور خاندان بھی بے خبر اور بے اثر نہ رہے، اس کے لیے مساجد کے منبر و محراب، مجالس وعظ، اسلامی اجتماعات و تقریبات، اخبارات و رسائل اور ابلاغِ عامہ کے تمام ذرائع پوری سرگرمی سے استعمال ہونے چاہئیں۔ میرے نزدیک یہ بنیادی کام ہے اور ان میں ان مشکلات اور خرابیوں کا اصل علاج ہے، جنہوں نے اس وقت نازک مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا وَّیُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ" (الانفال) (اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں ایک فیصلہ کی چیز دے دے گا اور تم سے تمہارے گناہ دُور کر دے گا) میں نے کلکتہ کے آخری اجلاس میں جس میں حاضرین کی تعداد کا اندازہ ۵ لاکھ کیا گیا ہے، صفائی سے اس معاملہ میں مسلمانوں کا احتساب کیا تھا، اور ان سے کہا تھا کہ وہ خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں اور اپنے گھروں کا جائزہ لیں کہ وہ اس شرعی قانون و تعلیم (جو دین کا ایک مستقل اور اہم شعبہ ہے) پر کس قدر عمل کرتے ہیں؛ ضرورت ہے کہ اس خطبہ و مقالہ کی اردو، ہندی اور علاقائی زبانوں میں زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔

۲۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ اور ملک کے دانشور اور حقیقت پسند غیر مسلموں کو اسلام کے عائلی نظام کی برتری، اس کے منصفانہ، عقلِ سلیم اور فطرتِ انسانی کے مطابق ہونے کو (جو خدائے حکیم و دانا، رؤف و رحیم اور خالقِ کائنات اور مربّیِ نوعِ انسانی کا بنایا ہوا ہے) علمی انداز ناقابلِ تردید دلائل اور مذاہب اور عائلی قوانین اور نظاموں کے تقابلی مطالعہ کے ساتھ انگریزی، اردو، ہندی اور علاقائی زبانوں میں پیش کیا جائے، یوں تو مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" ندوۃ العلماء (لکھنؤ)" مرکزی مسلم پرسنل لا آفس (مونگیر) مکتبۂ جماعتِ اسلامی ہند (دہلی) اور بعض دوسرے تصنیفی

تحقیقی اداروں کی طرف سے متعدد وقیع چیزیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن اس میں وسعت و ترقی اور اضافہ کی ضرورت ہے، اس موضوع پر صاحبِ نظر، صاحبِ ایمان ماہرینِ قانون اور اہلِ قلم سے کتابیں لکھوائی جائیں۔ سیمینار، سمپوزیم منعقد کیے جائیں، جن میں ممالک عربیہ کے چوٹی کے فضلاء و ماہرین فقہ اسلامی کو دعوت دی جا سکتی ہے اور میں بھی رابطہ عالم اسلامی کی بین الاقوامی المجمع الفقہی (مسائل و تحقیقات کی اکیڈمی) کا بنیادی رکن ہونے کی بناء پر اس کی ذمہ داری لے سکتا ہوں کہ وہ اس دعوت کو لبیک کہیں گے اور شوق سے شرکت کریں گے۔ اس سلسلہ میں اس موضوع پر نیز دوسرے ملی مسائل پر ڈائیلاگ (DIALOGUE) کا انتظام کرنا بھی مفید ہوگا اور بعض اہلِ علم اس پر سنجیدگی سے غور بھی کر رہے ہیں۔

۳ تیسری اور ایک بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر چہ بائنہ کو عدت کے بعد سابق شوہر سے قانونی طور پر مستقل گذارا دینا جس کو (MAINTENANCE) کے نقطہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، شرعاً، عقلاً کسی طرح درست نہیں، شرعاً تو اس لیے نہیں کہ قرآنی نصوص و احکام اور امت کے تعامل کے مطابق اس کی گنجائش نہیں، انتظاماً اس لیے کہ پھر اس کے بعد مسلم معاشرہ میں بھی سفاکی اور بے دردی کے وہ واقعات رونما ہوں گے جو ملک کے ایک وسیع معاشرہ میں پیش آ رہے ہیں اور نئی بیاہی ہوئی عورتیں مطلوبہ جہیز نہ لانے پر جلائی جا رہی ہیں اور ان سے کسی طرح پیچھا چھڑایا جا رہا ہے میں نے وزیر اعظم صاحب سے اپنی ایک نجی گفتگو میں صفائی سے کہا تھا کہ راجیو جی! اگر یہ قانون بن گیا تو یہ لکھ رکھیے کہ بجائے طلاق کے ذریعہ پیچھا چھڑانے کے ایسی ناپسندیدہ رفیقۂ حیات کو زہر دے کر یا جلا کر ختم کیا جائے گا، جیسا کہ آج ہمارے ملک میں بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

نفقۂ مطلقہ کی اس مستقل قانونی شکل (گذارے کو چھوڑ کر) شریعت کے بتائے ہوئے ان متبادل انتظامات کو زندہ اور قائم کرنا پڑے گا جن کی شریعت نے ترغیب دی ہے اور جو شریعت اسلامی کے برکات میں سے ہیں۔ مثلاً عورت کو والدین اور دوسرے مورثین کے ترکہ میں سے شرعی حصہ دلانا، جو بعض شکلوں میں واجب ہے اور بہت سے خاندانوں اور معاشروں میں عرصہ سے متروک ہے۔ مطلقہ کے قریبی رشتہ داروں

(ذوی الارحام) اولاد، بھائیوں اور اگر والدین زندہ ہوں تو ان کو اس کے ساتھ اعانت و مواسات (ہمدردی و غمخواری) اور صلہ رحمی کی ترغیب دینا، اس کی کفالت کا مناسب بندوبست کروانا، اگر نکاحِ ثانی کی عمر اور حالات ہیں تو اس کی ترغیب و تحریض، نیز اسلامی بیت المال کا قیام جس سے نادار اور ضرورت مند افراد کو ضروریاتِ زندگی اور قوتِ مالایموت فراہم کیا جائے۔

اس سے بڑھ کر پورے مسلم معاشرہ میں ہمدردی، سلوک، ایثار و فیاضی کا جذبہ پیدا کرنا، جو ہزاروں بیماریوں کا علاج ہے، اور ہزار مشکلات و مسائل کا حل، اور جو مسلم معاشرہ کو وضعی قوانین سے مستغنی کرتا ہے، اور صدرِ اوّل اور اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اس کی تابناک مثالیں ہیں اور اس کا زندہ ثبوت ملتا ہے، یہ ہیں کرنے کے وہ کام جن کو جلد سے جلد شروع ہو جانا چاہیئے اور جو اسلام کی روح، مزاج اور شریعتِ الٰہی اور تعلیماتِ آسمانی سے پوری مطابقت رکھتے ہیں اور انہیں میں شریعت کا اصل تحفظ اور اس ملک و عہد میں مسلمانوں کے ایک صاحبِ شریعت، صاحبِ کردار اور صاحبِ مقام مستحکم و باعزت، خود دار اور غیور ملت کی حیثیت سے باقی رکھنے کی ضمانت ہے۔

○○○○○○○○○○

سیرتِ نبوی کے ضمن میں دو عظیم تحفے
ڈاکٹر اسرار احمد
صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیم اسلامی
کے دروس تقاریر کے دو مجموعے اعلیٰ و دبیز کاغذ پر خوشنما طباعت کے ساتھ
رسولِ کامل
یعنی پاکستان ٹی وی سے نشر شدہ ۱۲ تقاریر کا مجموعہ اور
فرائضِ دینی اور اسوۂ رسول
سورۃ احزاب رکوع ۲،۳ کی روشنی میں

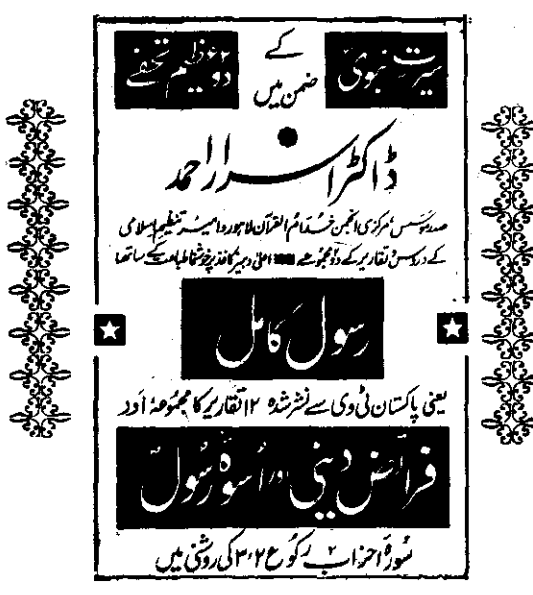

Coca-Cola is it!

TRADE-MARK REGD.

"COCA-COLA" AND "COKE" ARE THE REGISTERED TRADE-MARKS WHICH IDENTIFY THE SAME PRODUCTION OF THE COCA-COLA COMPANY.

paragon

رفتارِ کار

رپورتاژ

ہندوستان میں پندرہ دن

از قلم: عاکف سعید

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ گذشتہ سال کے اوائل میں والد محترم، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب حیدرآباد دکن کے بعض احباب کی دعوت پر بھارت تشریف لے گئے تھے اور اس دورے کی مفصل رپورٹ جون ۸۴ء کے 'میثاق' میں شائع ہوئی تھی ——— حیدرآباد دکن میں والد محترم اور ان کی تحریک 'دعوت رجوع الی القرآن' کے تعارف کی داستان بھی خاصی دلچسپ ہے ——— ہوا یوں کہ پچھلے چند سالوں کے دوران امریکہ کے اسفار میں والد محترم کا تعارف بہت سے ایسے حیدرآبادی مسلمانوں سے ہوا جو دین کے کاموں میں پیش پیش تھے۔ انہی میں سے بعض احباب نے[1] محترم والد صاحب کے دروسِ قرآن اور تقاریر کے کیسٹ بڑی تعداد میں حیدرآباد میں پہنچائے اور انہیں وسیع پیمانے پر پھیلا دیا۔ حیدرآباد کے مسلمانوں میں دین و مذہب سے لگاؤ اور علمی و عملی وابستگی کی جڑیں ہندو پاک کے بقیہ مسلمانوں کی نسبت زیادہ گہری ہیں۔ چنانچہ یہ کیسٹ وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے اور اُن کے ذریعے سے تحریک دعوت رجوع الی القرآن کا ایک وسیع حلقہ میں تعارف محترم والد صاحب کے حیدرآباد وُرود سے قبل ہی ہوگیا تھا۔ نتیجۃً تقاضے آنے شروع ہوئے کہ کچھ وقت نکال کر حیدرآباد تشریف لائیں ——— گویا حیدرآباد میں والد محترم کا تعارف بذریعہ کیسٹ اور بواسطہ امریکہ ہوا۔

بہرکیف ۱۹۸۵ء میں حیدرآباد کا دورہ ہوا جو نہایت کامیاب رہا۔ دروسِ قرآن کی مجالس میں بلامبالغہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ذوق و شوق سے شریک ہوتے رہے۔ اُس موقع پر وہاں کی معروف دینی و ملی آرگنائزیشن 'کُل ہند مجلس تعمیرِ ملت' کی جانب سے تقاضا آیا کہ والد صاحب ماہ ربیع الاوّل میں اُن کے سالانہ جلسۂ یوم رحمۃ للعالمین میں مہمان مقرر کی حیثیت سے شرکت فرمائیں!— وہاں احباب

---

[1] ان احباب میں جناب حیدر محی الدین غوری صاحب کا نام سرفہرست ہے جن سے امریکہ میں تعارف ہوا تھا اور اب امریکہ کو خیرباد کہہ کر انہوں نے مستقل طور پر حیدرآباد میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ موصوف انتہائی نیک اور مخلص دینی کارکن ہیں۔

رفقاء کے ذریعے معلوم ہوا کہ مجلس تعمیرِ ملت کے زیرِاہتمام ۱۲ ربیع الاول کا سالانہ جلسہ عام حیدر آباد شہر کا مرکزی اجتماع ہوتا ہے اور اس پہلو سے منفرد شان کا حامل ہوتا ہے کہ اس میں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ احباب کے اصرار اور جلسے کی اہمیت کے پیشِ نظر والد محترم نے اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے شرکت کا وعدہ کر لیا۔ پروگرام کیمطابق والد محترم کو پچھلے سال نومبر میں دوبارہ حیدر آباد تشریف لے جانا تھا لیکن پچھلے سال بعض وجوہات کی بنا پر بھارت کا پروگرام نہ بن سکا۔ ایک بڑا سبب یہ تھا کہ انہی دنوں حیدر آباد میں مسلم ہندو فسادات عروج پر تھے۔ چنانچہ پاکستان میں رہتے ہوئے ہم نے گمان کیا کہ ان حالات میں حیدر آباد جانا شاید ممکن نہیں ہو سکے گا ــــ بہرکیف پروگرام نہ بن سکا۔ لیکن بعد میں وہاں سے والد محترم کے نام شکوے کے انداز میں خطوط آئے کہ ہم تو آپ کے منتظر تھے اور توقع کر رہے تھے کہ آپ حسبِ پروگرام تشریف لائیں گے ــــ انہی خطوط کے ذریعے معلوم ہوا کہ ان فسادات کے باوصف جلسہ بہرحال اسی روایتی شان کے ساتھ منعقد کیا گیا ــــ والد صاحب نے مجلس تعمیرِ ملت کے سرکردہ افراد سے اپنی عدمِ شرکت پر معذرت کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا کہ وہ اگلے سال ضرور حیدر آباد کا پروگرام بنائیں گے، اور جلسے میں شرکت کریں گے ــــ چنانچہ اس سال یہی وعدہ سفرِ بھارت کی تقریب بنا[1]۔ اگرچہ حالات اس سال بھی کچھ زیادہ سازگار نہیں تھے، ایک طرف والد محترم کی اندرونِ ملک دعوتی و تحریکی مصروفیات اپنے عروج پر تھیں، تو دوسری جانب وسط اکتوبر میں عمرے کا پروگرام بن گیا ــــ شیڈول کے مطابق ۱۸ نومبر کو دہلی کے لیے روانہ ہونا تھا، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ۱۳ نومبر تک صورتِ حال غیر یقینی تھی ــــ اس کا سبب یہ تھا کہ پاسپورٹ پر انڈیا کی ENDORSEMENT کے سلسلے میں جو درخواست دی تھی۔ اس کا جواب آنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارا کیس دو وزارتوں[2] (MINISTRIES) کے سپرد کیا گیا اور وہاں سے CLEARANCE میں دیر ہونا بالکل قرینِ قیاس تھا ــــ بالآخر ۱۳ نومبر کو یہ مرحلہ طے پایا اور پھر ہنگامی طور پر ویزے کے حصول کی کوشش کی گئی۔ وہاں بھی یہ دقت پیش آئی کہ ہم نے چار شہروں کے ویزے کی درخواست دی تھی جن میں دہلی اور حیدر آباد کے علاوہ لکھنؤ اور احمد آباد کے شہر بھی شامل تھے لیکن انڈین ایمبیسی نے لکھنؤ اور احمد آباد کا ویزہ دینے سے صاف انکار کر دیا اور اس طرح ہمیں صرف دہلی اور حیدر آباد کا ویزا مل سکا۔ والد صاحب کو لکھنؤ کا ویزا نہ ملنے کا افسوس تھا اس لیے کہ ان کی خواہش تھی کہ اس مرتبہ لکھنؤ میں کچھ وقت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی معیت میں بسر کیا جائے۔

---

[1] پچھلے سال انڈیا کے دورے میں بڑے بھائی ڈاکٹر عارف رشید محترم والد صاحب کے ہمراہ تھے، اس بار قرعۂ فال راقم کے نام نکلا۔

[2] وزارتِ داخلہ اور وزارتِ مذہبی امور۔

اوران سے استفادہ کیا جائے ۔ بہر حال اس کشاکش کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں ۱۸ نومبر کی فلائٹ میں سیٹ نہ مل سکی تاہم بیس تاریخ کی انڈین ائیر لائن کی فلائٹ میں ہماری سیٹیں بک ہو گئیں۔

حسب پروگرام ۲۰ نومبر کی صبح ائیر انڈیا کی فلائٹ سے ہم دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ لاہور سے دہلی کا ہوائی سفر کل ۴۵ منٹ کی اڑان پر مشتمل ہے۔ چنانچہ صبح ۸ بجے ہم نے لاہور ائیرپورٹ سے اپنے سفر کا آغاز کیا اور ٹھیک ۴۵ منٹ بعد ہمارا جہاز دہلی ائیرپورٹ کو چھو رہا تھا۔ ائیرپورٹ پر ضروری کاغذی کارروائی اور کسٹم وغیرہ کی چیکنگ سے فراغت میں ہمیں قطعی دقت پیش نہیں آئی ۔ دہلی روانگی سے دو دن قبل ہم نے دہلی میں مولانا وحیدالدین خان کو اپنی آمد کی اطلاع بذریعہ تار دے دی تھی اور ہمیں توقع تھی کہ مولانا کے فرزند ڈاکٹر ثانی اثنین ائیرپورٹ سے باہر ہمارے منتظر ہوں گے۔ چنانچہ انہیں موجود نہ پاکر مجھے کسی قدر پریشانی ہوئی۔ لیکن جب والد صاحب کے چہرے پر کسی قسم کی تشویش کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو مجھے بھی حوصلہ ہوا۔ دراصل میرے لئے یہ انڈیا کے سفر کا پہلا موقع تھا۔ مجھے یہاں کے حالات کا قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا۔ والد صاحب نے ایک ٹیکسی والے کو ہاتھ دے کر روکا اور اسے نظام الدین ویسٹ چلنے کا کہا۔ ائیرپورٹ سے بستی نظام الدین کا فاصلہ لگ بھگ دس میل کا ہے۔ پچھلے سال بھی چونکہ والدِ محترم نے انڈیا کا دورہ کیا تھا اور دہلی میں مولانا وحیدالدین خان صاحب کے یہاں ' المرکزالاسلامی ' ہی میں قیام کیا تھا۔ لہٰذا انہیں جگہ کا کچھ اندازہ تھا۔ چنانچہ بستی نظام الدین پہنچ کر اسی اندازے سے کام لیتے ہوئے انہوں نے ٹیکسی والے کو گائڈ کرتے ہوئے دو ایک موڑ مڑنے کو کہا اور ہم ٹھیک المرکز الاسلامی کے گیٹ تک پہنچ گئے ۔ وہاں معلوم ہوا کہ مولانا وحیدالدین خان صاحب اور ان کے صاحبزادے ڈاکٹر ثانی اثنین دونوں ہی دہلی سے باہر کسی سفر پر ہیں۔ مرکز اسلامی کے دفتر میں اور کسی کارکن کے علم میں یہ نہیں تھا کہ مولانا کہاں تشریف لے گئے ہیں اور کب واپسی متوقع ہے ! اسی عمارت میں اوپر کی منزل میں مولانا موصوف کی رہائش ہے۔ مولانا کے اہلِ خانہ کو جب ہماری آمد کا علم ہوا تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ مولانا دو تین روز میں واپس تشریف لے آئیں گے۔ لیکن ساتھ ہی تاکید کی کہ ہم یہیں قیام کریں۔ چنانچہ نیچے دفتر میں ہمارے قیام کا اہتمام کر دیا گیا۔ یہاں سے چائے پی کر ہم نے مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ سے ملاقات کے لئے جامعہ رحیمیہ کا قصد کیا۔ بہت سے رکشا ڈرائیوروں سے کہا کہ بھائی ہمیں خواجہ میر درد روڈ لے چلو! جہاں قبرستانِ مہندیاں سے ملحق جامعہ رحیمیہ واقع ہے لیکن سب نے اس مقام کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ بہرحال یہاں بھی والد صاحب کا خداداد 'حافظہ' کام آیا۔ اور وہ خود رکشا والے کو ہدایت کرتے ہوئے جامعہ رحیمیہ تک لے گئے۔ مولانا اخلاق حسین

صاحب قاسمی مدظلہٗ، جو اس مدرسے کے مہتمم ہیں[1]، جامعہ میں موجود تھے نہایت تپاک سے ملے، متولی صاحب جناب علی محمد شبیر میوات بھی موجود تھے، بہت محبت سے ملے، وہیں صدر مدرس مولانا محمد نعیم صاحب مدظلہٗ سے ملاقات ہوئی جو دارالعلوم دیوبند میں ایک عرصے تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے تھے اور اب حال ہی میں وہاں کے پریشان کن حالات کے باعث دیوبند کو خیرباد کہہ کر مدرسہ رحیمیہ سے منسلک ہو گئے تھے۔ مولانا نہایت جید عالم لیکن انتہائی سادہ اور منکسر المزاج طبیعت کے مالک ہیں۔ نہایت متانت سے گفتگو کرتے ہیں جس میں علمی وقار جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ مولانا کے بارے میں معلوم ہوا کہ آپ مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب کے والد ہیں، جن سے ہماری شکاگو میں بڑی تفصیلی ملاقات رہی تھی۔

جامعہ رحیمیہ کی تاریخ بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس مدرسے کو سترھویں صدی عیسوی میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے شہر دہلی کی جنوبی سمت میں فصیل سے متصلاً باہر قائم کیا تھا۔ اور اپنے والد شاہ عبدالرحیم صاحب کے نام کی نسبت سے مدرسے کا نام 'جامعہ رحیمیہ' رکھا تھا۔ شاہ صاحب ہی کے دور میں یہ مدرسہ شہر کے اندر منتقل ہو گیا تھا ــــ لیکن شاہ صاحب کا پورا خاندان یہیں قبرستان مہندیاں میں مدفون ہے اور اس جگہ کو ایک طرح سے شاہ صاحب کے خاندانی قبرستان کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ادھر کچھ عرصہ سے جب دہلی کی توسیع شروع ہوئی تو اس جگہ کی اہمیت کے پیش نظر مسلمانوں کو یہ نظر آنے لگا کہ دیگر مقامات کی طرح یہ جگہ بھی اب مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائے گی اور کچھ بعید نہیں کہ حکومت اس قبرستان کو مسمار کر کے یہاں کوئی کمرشل بلڈنگ کھڑی کر دے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ایک مرد مومن، علی محمد کے دل میں یہ بات ڈالی کہ انہوں نے قبرستان مہندیاں میں جا ڈیرہ لگایا۔ اور حکومت کے ناپاک عزائم کے مقابلے میں سینہ سپر ہو گئے۔ انہوں نے کمال فراست سے وہاں

---

[1] مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کی ذات قارئین میثاق کے لئے محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام محاضرات قرآنی میں متعدد بار شرکت فرما چکے ہیں اور آپ کے مقالات اور مراسلات 'محکمت قرآن' اور 'میثاق' کی زینت بنتے رہے ہیں۔ مولانا قاسمی مدظلہٗ کا شمار دہلی کے چوٹی کے علماء میں ہوتا ہے۔ آپ دہلی کی تاریخی اہمیت کی مسجد حسین بخش میں خطیب ہیں، اور اپنے قلبی و ذہنی توسع کے باعث ہر طبقہ فکر کے مسلمانوں میں یکساں طور پر عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ دین کے لئے کام کرنے کی لگن اور ذہن و قلب کی یہی وسعت دراصل والد محترم اور مولانا کے مابین قرب کا باعث بنی ہے۔

آس پاس کے ہندوؤں سے ایسے عمدہ روابط قائم کئے اور شاہ صاحب اور ان کے اہل خاندان کی عظمت کا نقش اور رعب کچھ اس طور سے ہندوؤں پر بٹھایا کہ حکومت کے مقابلے میں خود وہاں کے ہندو ان کے سب سے بڑے معاون بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے علی محمد صاحب کے اندر کچھ ایسے اوصاف جمع فرما دیئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے گویا انہیں اسی کام کے لئے بنایا گیا تھا۔ ان کی شخصیت میں دلآویزی اور مومنانہ رعب جمع ہیں اور اس پر مستزاد ہے ان کی بے مثال جرأت رندانہ اور ہمت مردانہ! 'شیر میوات' دراصل ان کا خطاب ہے جو آنجہانی گاندھی نے ان کی جرأت و ہمت سے متاثر ہو کر انہیں دیا تھا۔ اور اب تو وہ اسی لقب یا خطاب کے حوالے سے پہنچانے جاتے ہیں ——

قبرستانِ مہندیاں کی مستقل حفاظت کے خیال سے جناب علی محمد صاحب شیر میوات نے بعض اکابر علماء کے مشورے اور تعاون سے ٹھیک اسی مقام پر جامعہ رحیمیہ کا اجراء کیا جہاں آج سے تین سو سال قبل حضرت امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے مدرسہ قائم فرمایا تھا۔ وسائل نہایت محدود تھے لیکن اللہ کی ذات پر بھروسہ تھا۔ چنانچہ اس صاحب عزم و ارادہ کی عزیمت رنگ لائی اور اب وہاں ایک بھرپور مدرسہ قائم ہے جس میں دو سو کے لگ بھگ طلبہ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں نہایت قابل اساتذہ اس مدرسہ سے وابستہ ہیں اور مدرسے کی عمارت 'دمادم صدائے کن فیکون'[1] کی سی شان کے ساتھ پیہم توسیع پذیر ہے۔

مدرسے کے قابلِ احترام اساتذہ سے ملاقات کے بعد ہم نے قبرستان میں حاضری دی۔ والد صاحب نے بڑی تفصیل سے مجھے اس مختصر سے قبرستان میں حضرت شاہ صاحب اور ان کے اہل خاندان کی قبور کے بارے میں بتایا اور ایک ایک قبر کی نشاندہی کی۔ اور انکشاف کیا کہ اسی قبرستان میں ہمارے بعض ایسے عزیز بھی مدفون ہیں جن کا تعلق ہماری دادی جان کے خاندان سے ہے۔ انہی میں مولانا محمد حسین فقیر ہیں جن کا شمار دہلی کے چوٹی کے علماء میں ہوتا ہے اور جو دہلی کی ایک اہم مسجد رحیمن بخش، میں ایک عرصہ خطابت کے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔ یہ وہی مسجد ہے جس میں سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید بطور خطیب مقیم رہے اور اب مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی مدظلہ اسی مسجد میں جمعہ کی خطابت فرماتے ہیں —— دوپہر کا کھانا وہیں مدرسے میں کھایا، شیر میوات ہمارے میزبان تھے دسترخوان پر ان کے کچھ اور ہنر بھی کھلے کہ انہیں کھانا کھلانے کی بھی خصوصی مہارت اور سلیقہ حاصل ہے کھانے میں میسنی روٹی، خاص دہلوی انداز میں پکا ہوا چٹ پٹا سالن، مکھن اور بہت سے دوسرے لوازمات کے

---

[1] اقبال کا شعر ہے:

"یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون"

ساتھ ان کا خلوص! یہ سب کچھ اس تناسب کے ساتھ جمع ہو گئے تھے کہ اس کھانے کی لذت شاید کبھی نہ بھلائی جا سکے۔ اس موقع پر والد صاحب کو ہمارے بزرگ شیخ جمیل الرحمٰن صاحب بہت یاد آ رہے تھے۔ جو خود بھی دہلوی ہیں اور دہلوی کھانوں کا خاص ذوق رکھتے ہیں کہ وہ اگر ساتھ ہوتے تو اپنے ذوق کی تسکین کا بہترین سامان یہاں پاتے ——— قیام دہلی کے دوران بعد میں بھی کئی مواقع پر ہمیں جناب شیر میوات کے کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ پُرتکلف بھی اور سادہ بھی! لیکن ہر بار یہی احساس ہوا کہ کسی بڑی سے بڑی پُرتکلف دعوت کا بھی وہ لطف نہیں ہوتا جو جناب شیر میوات کے یہاں کھانے کا ہوتا ہے۔ کچھ عجیب کشش تھی ان کے کھانے میں اور کھلانے کے انداز میں! ——— انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ تحریک آزادئ ہند کے دور میں ہندوستان کے سیاسی و دینی رہنماؤں میں سے کوئی قابل ذکر رہنما ایسا نہیں ہے جس کی میزبانی کا شرف جناب شیر میوات کو حاصل نہ ہوا ہو اور سب ہی سے انہوں نے اس معاملے میں داد وصول کی ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے پولیس اسٹیشن کا قصد کیا تاکہ اپنی آمد کا اندراج کرائیں۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی اور مولوی عطاء الرحمٰن صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ یہ مولوی عطاء الرحمٰن اسی مدرسے کے نوجوان اساتذہ میں سے ہیں، بہت جلد گھل مل جانے والے، خوش مزاج ساتھی ہیں۔ مولانا اخلاق حسین صاحب نے کمال عنایت سے انہیں مستقل طور پر ہمارے ساتھ پابند کر دیا تھا تاکہ دہلی میں ہمیں گھومنے پھرنے میں دقت نہ ہو۔ چنانچہ ان کی رفاقت ہمیں پورے قیام دہلی کے دوران حاصل رہی ———

پولیس اسٹیشن نزدیک ہی تھا۔ یعنی لگ بھگ نصف میل کے فاصلے پر، پیدل ہی وہاں تک پہنچے۔ ضروری کاغذی کارروائی سے فراغت کے بعد یہ پروگرام بنا کہ پہلے چل کر جامع مسجد دہلی دیکھی جائے۔ وہاں سے جماعت اسلامی کا مرکزی دفتر قریب ہی ہے۔ جہاں جماعت کے اکابرین سے ملاقات کرنے کے بعد حیدرآباد دکن کے لئے ائرانڈیا کی سیٹیں کنفرم کراتے ہوئے واپس نظام الدین آجائیں گے ——— چنانچہ ٹیکسی پکڑی اور سب جامع مسجد کے لئے روانہ ہوئے ——— نئی دہلی شہر بہت خوبصورت انداز میں تعمیر کیا گیا ہے۔ کشادہ سڑکیں، بلند و بالا عمارات اور پھر سرسبزی و شادابی (Greenery) نے شہر کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ میرا تاثر یہ تھا کہ یہ شہر سڑکوں اور عمارات کے طرز تعمیر کے اعتبار سے کراچی سے مشابہ ہے لیکن سرسبزی و شادابی میں لاہور سے زیادہ مشابہ ہے۔

قدیم شہر میں داخل ہوتے ہی، فضا یک دم بدل گئی۔ بھیڑ کے باعث اچھی خاصی کشادہ سڑک تنگ گلی میں تبدیل ہو گئی۔ ٹیکسی کے آگے پیچھے دائیں بائیں سائیکل رکشاؤں کا اژدہام تھا۔ سائیکل

رکشاؤں کو دیکھ کر ابتداءً کر طبیعت سخت مکدّر ہوئی۔ اس لئے کہ ان کو کھینچنے والوں میں سے اکثر و بیشتر کے جسم انتہائی لاغر تھے اور وہ شدید مشقت جھیل رہے تھے۔ ہجوم کے باعث جامع مسجد سے آدھ میل اِدھر ہی ٹیکسی کو چھوڑنا پڑا، یہ فاصلہ پیدل طے کیا۔ مولانا اخلاق صاحب سے والد صاحب نے گذارش کی۔ کہ وہ ہماری وجہ سے مشقت میں نہ پڑیں اور کچھ وقت کے لئے اپنے گھر میں جا کر آرام فرمالیں۔ اس لئے کہ مولانا کو رات بعد عشاء کسی مسجد میں سیرۃ النبیؐ کے موضوع پر خطاب فرمانا تھا۔ مولانا نے کچھ جھجکتے ہوئے اس پیشکش کو قبول فرمالیا اور ہم سے جدا ہو گئے، مولوی عطاء الرحمٰن بدستور ہمارے ساتھ تھے۔

لاہور کی بادشاہی مسجد کے برخلاف جو پرانے شہر کے ایک کنارے پر واقع ہے، دہلی کی جامع مسجد شہر کے لگ بھگ وسط میں واقع ہوئی ہے۔ اور اس کی 'کرسی' بھی نسبتاً زیادہ بلند ہے۔ یہ غالباً شہر کے وسط میں ایک ٹیلہ تھا جسے مسجد کے لئے منتخب کیا گیا ــــ گو باہر سے مسجد کی شان و شوکت پورے طور پر قائم ہے لیکن اندر سے مسجد دیکھنے پر احساس ہوا گویا اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ دیکھیں اس کو مکمل طور پر کھنڈر بننے میں کتنا عرصہ لگتا ہے! جامع مسجد کے آس پاس کا پورا علاقہ مسلمان آبادی پر مشتمل ہے، یہ علاقہ بہت بڑا کاروباری مرکز ہے اور یہاں ہر قسم کا بازار ہے۔ دہلی کا مشہور چاندنی چوک جامع مسجد سے بمشکل آدھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم نے مسجد میں دو رکعت نماز تحیۃ المسجد ادا کئے اور اس کی حالتِ زار پر حسرت آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے باہر نکل آئے، دہلی کا لال قلعہ مسجد کے مشرقی جانب ہے اور جامع مسجد سے صاف دکھائی دیتا ہے۔ اسی جانب سے مسجد سے متصلاً باہر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا مزار ہے یہاں بھی وہی ویرانی اور بے رونقی نظر آئی جس کا مشاہدہ مسجد میں ہوا تھا۔ دہلی کی جامع مسجد اور مزارِ ابوالکلام آزاد مرحوم میں محل وقوع کے اعتبار سے تقریباً وہی نسبت ہے جو لاہور کی بادشاہی مسجد اور مزارِ اقبال مرحوم میں ہے۔

حسبِ پروگرام یہاں سے فارغ ہو کر ہم مولوی عطاء الرحمٰن کی رہنمائی میں جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر پہنچے یہ دفتر دہلی کے بالکل قلب میں محلہ چتلی قبر میں واقع ہے۔ آبادی بہت گنجان ہے لیکن دفتر خاصا کشادہ ہے۔ امیر جماعتِ اسلامی ہند مولانا ابواللیث صاحب موجود نہیں تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی کام سے دہلی سے باہر تشریف لے گئے ہیں۔ تاہم قیم جماعت جناب افضل حسین صاحب موجود تھے۔ انہوں نے خندہ روئی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور بہت تکریم کی۔ کرناٹک کے امیر جماعت بھی موجود تھے۔ بہت محبت سے ملے، مزید برآں مدیر 'معارف' جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو دارالمصنفین اعظم گڑھ سے تشریف لائے تھے اور حکومتِ پاکستان کی دعوت پر پاکستان تشریف لے جا رہے تھے۔ جہاں انہیں اسلام آباد میں سیرت کانفرنس میں شرکت کرنا

تھی۔ وہیں مرادآباد کے جناب اقبال جعفری صاحب سے ملاقات ہوئی جن کے ذریعے والد صاحب نے مولانا افتخار فریدی صاحب مدظلہٗ کو پیغام بھجوایا کہ اگر ممکن ہو سکے تو ملاقات کے لئے دہلی تشریف لے آئیں۔ چائے پر یہ تمام اصحاب جمع تھے اور خوش گوار ماحول میں بے تکلفانہ انداز میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ نمازِ عصر کے بعد ہم نے قیم جماعت سے اجازت لی اور انہیں بتایا کہ ہمیں سیٹ کنفرم کرانے کے لئے ائر انڈیا کے دفتر میں جانا ہے۔ انہوں نے کمال لطف وکرم سے کام لیتے اپنے دفتر کے ایک مستعد کارکن 'یونس' کو ہمارے ساتھ کر دیا۔ یونس صاحب بڑے اچھے رہنما ثابت ہوئے۔ انہیں غالباً اس قسم کے کاموں کا خصوصی تجربہ تھا۔ چنانچہ اس مرحلہ کو سر کرنے کے لئے ہمیں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اگرچہ یہ دقت ضرور ہوئی کہ وقت بہت صرف ہوا اور اس کا سبب یہ تھا کہ ائر انڈیا کے آفس کے اکثر کمپیوٹر اس وقت خراب تھے اور تمام لوڈ ایک ہی کمپیوٹر پر تھا جس کی وجہ سے اپنی باری کے لئے خاصا انتظار کرنا پڑا ـــــــ بہرحال اس طرح ایک نہایت مصروف دن گذار کر ہم رات ۷ بجے واپس نظام الدین اپنے مستقر پر پہنچے، نمازِ عشاء کے لئے بستی نظام الدین میں تبلیغی جماعت کے مرکز جا پہنچے وہاں حسبِ معمول 'بیان' ہو رہا تھا اور "خوب" رونق تھی جو ہمارے مستقر سے صرف ۵ منٹ کی پیدل مسافت پر تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ عشاء بہت تاخیر سے ادا کی جاتی ہے چنانچہ نزدیک ہی ایک اور مسجد میں نماز ادا کی۔

رات کے کھانے کے بعد مولانا وحید الدین خاں صاحب کے بڑے صاحبزادے جناب ظفر الاسلام صاحب "اوکھلا"[1] سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ ظفر الاسلام صاحب ایک طویل عرصے انڈیا سے باہر رہنے کے بعد حال ہی میں غالباً ایک سال قبل، واپس انڈیا تشریف لائے ہیں اور اب مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ آپ نے قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ نہایت سنجیدہ اور قابل آدمی ہیں اور تعلیم و تعلّم کے کاموں سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ والد محترم ان سے دینی تحریکات کے موضوع پر خاصی دیر تک تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ انہوں نے بھی والد صاحب کی بعض تصانیف میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔

(جاری ہے)

---

[1] "اوکھلا" دراصل ایک آبادی کا نام ہے جو دہلی کے مضافات میں ہے اور بستی نظام الدین سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔

ٹینٹ اور ترپال

بنانے کا
ممتاز ادارہ

ایچ نظام دین اینڈ سنز

مرکزی دفتر

محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

Regd. L No. 7360

[illegible] "MEESAQ" LAHORE

Vol. [illegible] JANUARY 1986 | No. 1

Siddiq Sons Industries Ltd.

Largest Manufacturers & Exporters of :

WATERPROOF COTTON CANVAS, TARPAULINS, TENTS, WEBBING AND OTHER CANVAS PRODUCTS.

HEAD OFFICE :

5-C, 5th FLOOR, SIDCO AVENUE CENTRE
264-R. A. LINES, KARACHI (PAKISTAN)

2-K GULBERG II, SHAHRAH-E-IQBAL, LAHORE
TELEPHONE : 870512 880731